قرآنی نظامِ ربوبیت کا نقیب

طلوعِ اسلام

اگست 1978

ہماری آزادی اور غلامی کا معیار

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت صرف خدا کی ہوتی ہے جس کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن مجید کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کیلئے آپکو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔ (قائد اعظم محمد علی جناح)

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام بی ۲۵ گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ 2 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک	ٹیلی فون نمبر	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان ..... ۲۴/- روپے غیر ممالک ..... ۳ پونڈ	۸۸۰۸۰۰ خط وکتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور	۲ دو روپے
جلد ۳۱	اگست ۱۹۷۸ء	شمارہ ۸

فہرست

۱۔ لمعات ——— ۲
۲۔ اسلامی قوانین ——— ۱۲
۳۔ جنرل محمد ضیاء الحق کی تقریر ——— ۱۳
۴۔ مقصود بالذات کیا ہے؟ ——— ۱۷
——— فرد یا مملکت ———
——— (محترم پرویز صاحب کا خطاب) ———
۵۔ باب المراسلات ——— ۴۱
(۱) قرآنِ کریم کے مطابق فیصلے ———
(۲) معراجِ شریف کب ہوا؟ ———
۶۔ حقائق وعبر ——— ۴۳
(۱) یہ اسلامی قوانین مرتب کریں گے؟ ———
(۲) بات چل نکلی ہے ..... ———
(۳) یہ کس قسم کے کوڑے ہیں؟ ———
(۴) اسے کیا کہیں گے؟ ———
(۵) اے کاش! ———
(۶) ذرا ہنس لیجئے ———
۷۔ احتساب ——— (قسط دوم) ——— ۴۹

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقام اشاعت۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ۱۷ ہسپتال روڈ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

حضور نبی اکرمؐ جب ہجرت کے بعد مدینہ تشریف لائے، تو آپ نے دیکھا کہ یہودی عاشورہ کے دن کا روزہ رکھتے ہیں۔ دریافت کرنے پر انہوں نے کہا کہ اس دن ہمیں فرعون کی غلامی سے نجات ملی تھی۔ ہم اس یومِ آزادی کی یاد میں یہ تقریب مناتے ہیں اور روزہ رکھتے ہیں۔ آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ تم بھی ان کے ساتھ اس دن کا روزہ رکھو کیونکہ کسی قوم کی غلامی سے رستگاری اسی قوم کے لئے باعثِ مسرت نہیں ہوتی۔ وہ ساری انسانیت کے لئے وجہِ انشادمانی ہوتی ہے۔ اس لئے ایسی تقاریب کو عالمگیر حیثیت سے منانا چاہیئے۔

اس میں شبہ نہیں کہ قوموں کی زندگی میں بعض واقعات ایسے آتے ہیں جن کی یاد قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے، لیکن یاد کوئی "بت" نہیں ہوتی کہ اس کی پرستش کی جائے۔ یہ ذریعہ ہوتی ہے شعورِ ملّی میں اس انقلاب کو تازہ رکھنے اور آگے بڑھانے کا جس کی یاد میں وہ تقریب منائی جاتی ہے۔ مسلمانانِ ہند کی ملّی زندگی میں اسی قسم کا ایک انقلاب آفریں دن آیا جسے ہم یومِ آزادی کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہ دن، درحقیقت حدِ فاصل تھا ہماری گذشتہ اور آئندہ زندگی میں۔ یہ دن تھا اس عہد کا کہ ہماری آنے والی زندگی گذشتہ زندگی سے یکسر مختلف ہوگی۔ ہماری گذشتہ زندگی تھی انسانوں کے وضع کردہ نظام کے تابع چلنے کی۔ وہ نظام جو موجب تھا ہمارے اخلاقی تسفّل اور ملّی تنزل کا، جس نے ہمیں شرفِ انسانیت سے یکسر محروم کر رکھا تھا۔ جس میں ہر سرمایہ دار غریبوں کی محنت کے ماحصل کو لوٹ کھسوٹ کر لے جاتا تھا۔ جس میں مزدوروں کے خون کی سرخی، اربابِ ثروت کے عشرت کدوں کی رنگینی کا سامان فراہم کرتی تھی۔ جس میں غریبوں کی ہڈیاں اُمراء کے قصرِ تعیش کے لئے چونا بنتی تھیں۔ دو لفظوں میں یوں کہئے کہ یہ وہ نظام تھا جس نے ہمیں خیر و برکت کے ہر چشمہ سے دور پھینک رکھا تھا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کا دن اس اعلان کا دن تھا کہ: جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ۔ وہ انسانیت سوز نظام ختم ہوا اور ہم نے ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کر لیا جس میں اس نظام کا آغاز کیا جائے گا، جس کا سرنامہ "احترامِ آدمیت" ہے۔ جو انسانوں کا وضع کردہ نہیں بلکہ اقدارِ خداوندی کا مظہر ہے۔ یہ ہے وہ دن جسے یومِ آزادی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس کی رسمی اور بے روح تقریب ہر سال منائی جاتی ہے۔ اس آزادی کے اکتیس سال کے عرصے میں ہم کہاں پہنچ گئے ہیں، اسے زبانِ قلم تک لانے کی ہم تاب نہیں لا سکتے۔ یہ سینوں میں دبی ہوئی وہ آگ ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے ——— اگر گویم زباں سوزد ——— وگر دم در کشم ترسم کہ مغزِ استخواں سوزد۔

قرآن کریم میں یوں تو مختلف اقوام سابقہ کے عروج و زوال کی داستانیں بیان کی گئی ہیں، لیکن انہیں داستانِ بنی اسرائیل کو بڑے اصرار اور تکرار سے دہرایا گیا ہے۔ ہماری بصیرت کے مطابق، یہ اس لئے کہ خدائے علیم و خبیر کو معلوم تھا کہ صدرِ اوّل کے بعد امتِ مسلمہ قوم بنی اسرائیل کے قدم بقدم چلے گی اور جو کچھ اس قوم کے ساتھ بیتی وہی اس اُمت پر بھی گزرے گی۔ ذرا غور کیجئے کہ ملّتِ پاکستانیہ اور قوم بنی اسرائیل میں کس قدر مماثلت ہے۔ جس طرح ہم ہندوستان میں ہندو اور انگریز کی غلامی کے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے اسی طرح بنی اسرائیل فرعون کی محکومیت کی زنجیروں میں مقید تھے۔ ان حالات میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔ وَنُرِيدُ أَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ۝ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ۔ (۲۸/۵) "ہم نے ارادہ کیا کہ جس قوم کو اس قدر کچلا جا رہا تھا۔ اسے ہم سرفرازیاں عطا کر دیں اور اسے ایک ایسے خطۂ زمین کا مالک بنا دیا جائے جہاں ان کی اپنی حکومت ہو"۔ یہ خدا کا ایسا انعام تھا جس کی انہیں یہ کہہ کر بار بار یاد دہانی کرائی جاتی تھی کہ: يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ۔ (۲/۴۷) "اے بنی اسرائیل تم ہماری اس نعمت کو یاد کرو جس سے ہم نے تمہیں نوازا تھا اور تمہیں تمہاری ہمعصر اقوام میں بلند مقام عطا کر دیا تھا"۔ آپ نے غور کیا کہ داستانِ بنی اسرائیل کے اس واقعہ اور حصولِ پاکستان میں کس قدر مماثلت ہے۔

لیکن اس کے بعد بنی اسرائیل نے کس طرح کفرانِ نعمت کیا اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ قرآن کریم کے صفحات اس سے بھرے پڑے ہیں۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا، اسے ان عبرت آموز الفاظ میں دہرایا گیا کہ: وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ (۲/۶۱) "ان پر خدا کا غضب طاری ہوا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان پر ذلّت اور مسکنت کی مار ماری گئی۔ وہ غیروں کی نگاہوں میں ہی نہیں خود اپنی نظروں میں بھی ذلیل و خوار ہو گئے حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ: ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا۔ (۳/۱۱۲) وہ جہاں بھی گئے ذلتیں اور رسوائیاں سائے کی طرح ان کے پیچھے لگی رہیں، اور کوئی گوشہ ایسا نہ رہا جہاں انہیں حقارت کی نظروں سے نہ دیکھا گیا ہو۔

نگاہِ عبرت سے دیکھئے کہ کیا بنی اسرائیل کی اس کیفیت اور ہماری موجودہ حالت میں کچھ بھی فرق ہے؟ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہماری حالت ان سے بھی بدتر ہو چکی ہے۔ وہ "دیوارِ گریہ" کے سامنے کھڑے ہو کر روتے تھے تو اپنے مستقبل کی طرف سے مایوس نہیں تھے۔ ان کے برعکس ہماری حالت یہ ہو چکی ہے کہ جب بھی دو پاکستانی آپس میں ملتے ہیں تو غیر شعوری طور پر ان کے لب پر یہ الفاظ آ جاتے ہیں کہ اب کیا ہو گا؟ کیا پاکستان باقی رہے گا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ قوموں کی زندگی میں اس انداز کا یاس اور ناامیدی کا احساس سکراتِ موت کی ہچکیاں ہوتی ہیں۔ ہم اس یاس انگیز تاثر کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتے اور نگاہ کا رُخ اس طرف پھیرتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا؟ اس اہم ترین سوال کا جواب تلاش کرنے کے لئے ۳۰ سال کمیشن پر کمیشن بٹھائے گئے، کمیٹیوں پر کمیٹیاں متعین کی گئیں، رپورٹوں پر رپورٹیں لکھی گئیں، لیکن اس کے سوا کچھ نہ ہوا جو غالبؔ نے کہا تھا کہ: ؎

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں؟

مرض بڑھتا گیا اور اس کا علاج تو ایک طرف، تشخیص تک بھی کسی سے نہ ہو سکی۔ لیکن ہم نے جب قرآن کریم کے بابِ عالی پر دستک دی تو اس نے یہ کہہ کر بصد تبسم دروازہ کھول دیا کہ: اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ "ہم ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتے ہیں۔ اور اس کی ہر مشکل کا حل بتاتے ہیں۔ تمہاری اس مشکل کا حل تو ہم چودہ سو سال پہلے بتا چکے ہیں اور وہ یہ ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔ (۱۳/۱۱)

"تم تو ایک طرف، خدا بھی اس قوم کی خارجی دنیا میں کوئی تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ قوم اپنی داخلی دنیا میں تبدیلی پیدا نہ کر لے۔"

غور فرمائیے کہ کس حتم و یقین و تحدی سے کہا گیا ہے کہ جو جی میں آئے کر کے دیکھ لو۔ جب تک تم اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا نہیں کرو گے۔ جب تک تم اپنے قلب و دماغ کو نہ بدلو گے۔ جب تک تم اپنی ذہنیت میں تبدیلی پیدا نہ کرو گے۔ جب تک تمہاری اقدارِ حیات نہ بدلیں گی، اس وقت تک تمہارے احوال و ظروف میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ یہ اس خدا کا فیصلہ ہے جس کے فیصلے دنیا کی کوئی طاقت نہیں بدل سکتی، سارے انسان مل کر بھی نہیں بدل سکتے۔

اور ہم ہیں کہ ہم نے تیس (۳۰) برس سے خدا کو چیلنج دے رکھا ہے کہ ہم اپنی داخلی دنیا میں تبدیلی کئے بغیر اپنی خارجی حالت میں تبدیلی کر کے دکھائیں گے۔ آپ کے فیصلے کے علی الرغم ایسا کریں گے اور (معاذ اللہ) آپ کے اس دعوے کو جھوٹا ثابت کر دیں گے۔ ہم تیس (۳۰) برس سے خدا کے خلاف یہ جنگ لڑ رہے ہیں۔ ایسا نہ بر بنائے جہالت ہو رہا ہے اور نہ ہی محض اتفاقی طور پر۔ یہ سب کچھ جانتے بوجھتے ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت کیا جا رہا ہے۔ اس سکیم کی حقیقت بڑے گہرے غور و فکر سے سمجھے جانے کی محتاج ہے۔

تحریکِ پاکستان کی سب سے شدید مخالفت مذہبی پیشوائیت (نیشنلسٹ علماء) کی طرف سے ہوئی تھی۔ ان میں جماعتِ اسلامی پیش پیش تھی۔ ان کا موقف اور اعتراض یہ تھا کہ مسلمانوں میں اس قدر اخلاقی عیوب پائے جاتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں کوئی اسلامی مملکت قائم نہیں ہو سکتی۔ اسلامی مملکت کا مطالبہ کرنے کی بجائے، اس قوم کے قلب و دماغ کی تطہیر مقدم ہے۔ جب تک ایسا نہیں ہو گا انکی حالت میں تبدیلی پیدا نہیں ہو گی۔ اس کے جواب میں ان سے کہا جاتا کہ یہ جنگ ایک خطۂ زمین حاصل کرنے کی ہے تاکہ اس میں اسلامی مملکت قائم کی جا سکے۔ یہ خطۂ زمین حاصل ہو جائے تو پھر آپ تطہیرِ قلب و نگاہ کے لئے کوشش کیجئے گا۔ اس کے جواب میں وہ پھر یہی کہتے کہ نہیں! تغیرِ نفس قدم اوّل ہے۔ اس کے بغیر خطۂ زمین کا حاصل کرنا بھی لاحاصل ہے۔ انہوں نے اس وعظ و نصیحت پر ہی اکتفا نہ کیا، اس تحریک کی بھرپور مخالفت کی۔ لیکن ان کی مخالفت کے علی الرغم یہ خطۂ زمین حاصل ہو گیا۔ اور دیکھنے والے کیا دیکھتے ہیں کہ یہ تمام حضرات یہاں جمع ہو گئے۔ اگر انہیں اسلامی مملکت کے قیام کے مسئلہ سے ذرا بھی دلچسپی ہوتی تو ان کے کرنے کا کام یہ تھا کہ قوم میں تطہیرِ فکر و نظر کے لئے تدبیریں سوچتے، اور کوششیں کرتے۔ لیکن یہاں انہوں نے ایک ایسی روش اختیار کی جس سے، اس قسم کی تطہیر کے لئے کچھ کرنا تو

درکنار، کسی کا اس طرف دھیان تک نہ جائے۔ اس کے لئے انہوں نے دہریوں اور ملحدوں کا سا طریق اختیار نہیں کیا۔ جس طرح انہوں نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت، مذہب کے نقاب میں کی تھی، اسی طرح یہاں اپنی اس اسکیم کو بھی خالص اسلامی پردوں میں آگے بڑھایا۔ انہوں نے یہاں آتے ہی یہ کہا کہ چونکہ اس مملکت کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اس لئے یہاں کرنے کا کام یہ ہے کہ اسلامی قوانین نافذ کئے جائیں۔ آپ سوچئے کہ کسی کا خیال تک تو کجا، تصوّر تک بھی اس طرف جا سکتا تھا کہ یہ مطالبہ مملکتِ پاکستان کی بنیادوں تک کو متزلزل، اور اسلام کو ایک چلا ہوا کارتوس ثابت کر دے گا۔ کوئی شخص ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اور اگر کوئی سوچ بھی سکتا تو انہوں نے اپنے پروپیگنڈے کا اس قدر شور برپا کیا کہ ہر سوچ اس شور میں ڈوب کر رہ گئی۔ آپ قرآن کریم میں شروع سے آخر تک دیکھئے اس نے اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے بعد عَمِلُوا الصّٰلِحٰت کہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایمان کے بغیر عملِ صالحہ کا امکان ہی نہیں۔ ایمان کے معنی ہیں تغیرِ نفس۔ اور عملِ صالحہ کے معنی ہیں اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنا۔ یہ وجہ ہے جو اللہ تعالےٰ نے کہا کہ جب تک تم میں تغیرِ نفس نہیں ہوگا تمہارے اعمال کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکیں گے۔ ان حضرات نے تغیرِ نفس کا نام تک نہیں لیا اور اسلامی قوانین کا شور مچاتے چلے گئے۔ یہ ہے وہ جنگ جو انہوں نے یہاں "خدا کے خلاف" برپا کر رکھی ہے اور ایسے نگاہ فریب انداز سے کہ کوئی شخص خیال تک نہیں کر سکتا کہ یہ خدا کے خلاف جنگ اور پاکستان کی مخالفت ہے۔ اس کے برعکس ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہ بہت بڑا جہاد ہے جس میں یہ حضرات اس طرح مصروف ہیں۔

"تغیرِ نفس" کے بغیر قوانین کی پابندی کس طرح نتیجہ خیز نہیں ہوتی، اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ یہ مثال بھی ہم فوجی زاویۂ نگاہ سے پیش کرتے ہیں۔

۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہم نے دیکھا کہ جب دشمن کی یلغار باٹاپور کی نہر تک آ پہنچی تو یہاں کے اچھے اچھے لوگوں نے بھاگنا شروع کر دیا تاکہ وہ اپنی جانیں بچا سکیں۔ جان کا بچانا خود زندگی کا بنیادی تقاضا ہے۔ اور وہ اسی تقاضے کے ماتحت ایسا کر رہے تھے۔ لیکن دوسری طرف ہم نے دیکھا کہ وہ سپاہی جو مورچوں میں امن و اطمینان سے بیٹھے تھے اور جہاں ان کی جانیں بالکل محفوظ تھیں، وہ نہ چپکے سے وہیں بیٹھے رہے، اور نہ ہی راوی کے پل کی طرف بھاگے، بلکہ اپنے اپنے محفوظ مقامات سے نکل کر انہوں نے میدانِ جہاد کی طرف رخ کر لیا جہاں دشمن کی ہر آہٹ موت کا پیغام دیتی تھی۔ جانیں بچا کر راوی کی طرف بھاگنے والے بھی انسان تھے، اور یہ موت کی طرف لپک کر جانے والے بھی انسان۔ ان دونوں میں فرق کیا تھا؟ صرف "تغیرِ نفس" کا فرق۔ ان سپاہیوں کے اندر یہ نفسیاتی تبدیلی آ چکی تھی کہ جان کی حفاظت بے شک نہایت ضروری ہے لیکن جب کبھی ایسا وقت آ جائے کہ جان اور کسی ایسی قدر میں جو جان سے زیادہ عزیز ہو (TIE) پڑ جائے تو اس "قدر" کی حفاظت کے لئے جان دے دینا ہی تقاضۂ حیات ہے۔ اس "تغیرِ نفس" کو ایمان کہا جاتا ہے۔ اور اس ایمان کے بعد انسان کی ہر نقل و حرکت عملِ صالح بنتی ہے۔

فوج ایک بہت بڑی تنظیم کا نام ہے۔ اس کی بنیاد نظم و ضبط پر ہے۔ اس میں سپاہیوں کو وقت پر اٹھنا، وقت پر چلنا، اور وہ بھی ایک خاص انداز سے چلنا، ہر صبح پی، ٹی کرنا۔ وقتاً فوقتاً فوجی مشقوں کی صعوبات

برداشت کرنا۔ نشانہ بازی کی مشقیں کرنا پڑتا ہے۔ ان تمام امور کیلئے ان کے لئے قوانین و ضوابط موجود ہوتے ہیں جن کی پابندی ان سپاہیوں پر لازمی ہوتی ہے جس سے اس پابندی کی ذرا سی بھی خلاف ورزی ہوتی ہے اُسے اس کی سزا ملتی ہے۔ اب آپ سوچئے کہ کسی فوج میں یہ تمام نظم و نسق مکمل شکل میں موجود ہو۔ سپاہی ان کی پابندی بھی حزم و احتیاط سے کرتے ہوں۔ وہ چاق و چوبند بھی ہوں۔ ان کے پاس اعلیٰ درجے کا اسلحہ بھی موجود ہو لیکن خطرہ کا بگل بجنے پر وہ میدانِ جنگ کی طرف رُخ کرنے کی بجائے اپنی جان بچانے کے لئے وادی کے پل کی طرف بھاگ نکلیں۔ تو کیا ایسی فوج وہ مقصد حاصل کر سکے گی جس کے لئے اس قدر اہتمام کیا گیا تھا؟ ان سپاہیوں میں کس چیز کی کمی تھی؟ اسی "تغیرِ نفس" کی جس کی بناء پر سپاہی موت کو دلہن کی طرح گلے لگاتے ہیں۔ ان میں ایمان کا فقدان تھا جس کی وجہ سے فوج نظم و نسق اور قوانین و ضوابط اور ان کی پابندی نہ صرف یہ کہ کوئی مثبت نتیجہ پیدا نہ کر سکی بلکہ ملک کے لئے تباہی کا موجب بن گئی۔ ہمارے یہ مدعیانِ نظامِ اسلامی ایک ایسی فوج پیدا کرنا چاہتے ہیں جو قوانین کی پابندی تو بڑی شدت سے کرے لیکن جس میں "تغیرِ نفس" پیدا نہ ہوا ہو۔ اس مثال سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ ان حضرات کی یہ ساری کوششیں جنہیں پاکستان اور اسلام پر احسانِ عظیم کے رنگ میں پیش کیا جاتا ہے کس طرح اسلام اور پاکستان دونوں کے خلاف محاذ آرائی ہے۔

"تغیرِ نفس" عقیدہ یا ایمان۔ خارجی قانون کے بغیر بھی کس طرح مثبت نتائج پیدا کر دیتے ہیں اسے بھی ایک مثال کی رو سے سمجھئے۔ اس وقت دنیا میں فحاشی عام ہو رہی ہے اور خود ہمارے ملک میں بھی یہ وبا کی طرح پھیل رہی ہے۔ اس کے خلاف ہر طرف سے آوازیں اُٹھ رہی ہیں۔ حکومت کی طرف سے بلند آہنگ تدابیر اختیار کی جاتی ہیں، سخت قوانین بنائے جاتے ہیں۔ لرزہ انگیز سزائیں دی جاتی ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود یہ سیلاب ہے کہ اور تیزی سے بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ اسی فضا میں ایک نوجوان لڑکا ہے۔ نہایت بدنام، بدمعاش، عیاش، جنسیات میں ڈوبا ہوا معاشرہ کی کوئی لڑکی اس کے ہاتھوں اپنی عصمت محفوظ نہیں سمجھتی۔ اس لڑکے کی ایک ہمشیرہ ہے۔ نوجوان، خوبصورت، ناکتخدا۔ وہ دونوں ایک کمرے میں رہتے ہیں اور وہیں راتوں کو تنہا سوتے ہیں، عورت ہونے کی جہت سے اس لڑکی اور اُن لڑکیوں میں کوئی فرق نہیں جن کے پیچھے یہ مارا مارا پھرتا ہے۔ لیکن راتوں کی تنہائیوں اور تاریکیوں میں بھی وہ اس لڑکی کی طرف جو اس کی بہن ہے کبھی نگاہِ بد سے نہیں دیکھتا۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ اس کے دل میں یہ خیال پختہ عقیدہ کی شکل اختیار کر چکا ہے کہ بہن کے ساتھ جنسی تعلق جائز نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس لڑکی (یعنی بہن) کے حوالہ سے جنسی جذبہ کا خیال تک اس کے دل میں نہیں ابھرتا۔ اس لڑکے کے ہاتھوں اس لڑکی کی عصمت ہمیشہ محفوظ رہتی ہے۔ اس کے لئے نہ کسی قانون کی ضرورت ہے نہ کسی سپاہی کی حاجت۔ اس کا "تغیرِ نفس" خارجی اسباب کے بغیر اس لڑکی کی عصمت کا ضامن ہوتا ہے۔ یہ ہے جو "تغیرِ نفس" کرتا ہے۔ ایسا کچھ اِدھر مشرق ہی میں نہیں ہوتا۔ مغرب میں بھی، جہاں کسی بالغ جوڑے کا باہمی رضامندی سے جنسی اختلاط نہ معاشرے کے نزدیک کوئی معیوب بات ہے، نہ قانون کی رو سے کوئی جرم، یہ "تغیرِ نفس" یہی نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ کچھ سال اُدھر کا ذکر ہے، اخبارات میں امریکہ کے ایک جوڑے کا واقعہ شائع ہوا تھا جو آٹھ دس سال سے میاں بیوی کی حیثیت سے خوش و خرم رہتا تھا اور اس کے نہایت خوبصورت بچے بھی تھے۔ ایک دن اتفاقاً اُن کے علم میں یہ بات آئی کہ وہ بہن بھائی ہیں۔

ہوا یوں کہ وہ بچے ہی تھے کہ لڑائی کے دوران ان کے ماں باپ مارے گئے۔ لڑکے کو کینیڈا کا کوئی فوجی اپنے ساتھ لے گیا اور لڑکی کو ایک امریکن اپنے ہمراہ لے آیا۔ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے بالکل بے خبر تھے۔ اتفاق سے وہ لڑکا امریکہ جا پہنچا اور یونہی اس کی ملاقات اس لڑکی سے ہوگئی جو اب اس کی طرح جوان ہوگئی تھی۔ ان دونوں کی باہمی رضامندی سے شادی ہوگئی۔ لیکن برسوں تک انہیں اپنی سابقہ زندگی کا علم نہ ہوا، کیونکہ بچپن کا کوئی واقعہ انہیں یاد نہ تھا۔ جس دن انہیں معلوم ہوا کہ وہ بھائی بہن ہیں، ان پر جو قیامت گذری اس کا اندازہ ان بیانات سے لگ سکتا ہے جو انہوں نے اخبارات کو دیئے۔ وہ دونوں روتے چیختے رہتے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کریں۔ بہرحال پادریوں نے بڑی مشکل سے ان کی تسلی تشفی کی اور وہ پھر بہن بھائی کی زندگی بسر کرنے لگ گئے۔ یہ کیا تھا؟ صرف اس عقیدہ کا نتیجہ کہ بہن بھائی میاں بیوی نہیں بن سکتے۔ قرآن کریم اس قسم کے "تغیرِ نفس" کو اصلاح کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ (وہ ہر لڑکے کے دل میں یہ عقیدہ راسخ کر دیتا ہے کہ اس کی اپنی بیوی کے سوا، دنیا کی ہر لڑکی اس کی بہن ہے جس کی طرف نگاہِ بد سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ یوں معاشرہ سے فحاشی ختم ہو جاتی ہے)۔ خالی قوانین کی رو سے اس قسم کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔

آپ نے غور فرمایا کہ نفسیاتی تغیر کو پسِ پشت ڈال کر قوانین کو مملکت کا مقصود و منتہیٰ قرار دینا قوم کو کہاں لے جاتا ہے؟ جہاں تک قوانین کا تعلق ہے آج بھی ان کی کوئی کمی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود جو خرابیاں عام ہوتی جا رہی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم "تغیرِ نفس" کے بغیر محض قوانین کی رو سے تغیرِ احوال کے درپے ہیں۔ خدا کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ قوانین کا نام اسلامی رکھ دیجئے ایسا خود بخود ہو جائے گا! ہم یہ نہیں کہتے کہ قوانین کی ضرورت نہیں۔ ان کی بھی ضرورت ہے لیکن وہ مستثنیات کے لئے ہوتے ہیں اور ان سے معاشرہ کا نظم و نسق اور ربط و ضبط قائم رہتا ہے۔ لیکن اصلاحِ احوال، تغیرِ نفس کے بغیر ممکن نہیں۔

لیکن یہاں قوانین کے سلسلے میں بھی ایک عجیب چکر چلایا گیا ہے۔ پہلے یہ کہا گیا کہ اسلامی مملکت میں شخصی قوانین (پرسنل لاز) ہر فرقے کے الگ ہوں گے، حالانکہ اسلام میں پرسنل لاز اور پبلک لاز میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ اب رہے پبلک لاز۔ تو ظاہر ہے کہ یہ لاز بہرحال ساری مملکت میں ایک ہی ہونے چاہئیں اور ہر ایک پر ان کا اطلاق یکساں۔ جب پوچھا گیا کہ پبلک لاز کا ایسا ضابطہ کس طرح مرتب ہو سکے گا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں تو جواب دیا گیا کہ کتاب و سنت کی رو سے ایسا ضابطہ بن سکتا ہے۔ قریب بیس سال تک یہ حکومت کے خلاف یہ پروپیگنڈہ جاری رکھا گیا کہ یہ لوگ بدنیت ہیں۔ ملک میں اسلامی قوانین نافذ نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن آخر کار انہیں اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ:

> کتاب و سنت کی رو سے کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں ہے جو پبلک لاز کے معاملے میں حنفیوں، شیعوں، اہلحدیثوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔
>
> (مودودی صاحب کا بیان۔ بحوالہ، ایشیا۔ ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء)

یعنی ۲۰ سال تک یہ حضرات ایسا مطالبہ پیش کرتے رہے جو خود ان کے نزدیک بھی ناممکن العمل تھا۔ اور دنیا یہ دیکھ کر

محو حیرت ہے کہ اس کے بعد بھی آج تک اُسی مطالبے کو برابر دہرایا جا رہا ہے کہ پبلک لاز کا ضابطہ کتاب و سنت کے مطابق مرتب کرائیے۔ یعنی وہی مطالبہ جسے یہ خود ناممکن قرار دیتے ہیں۔

ہم نے جو کچھ اوپر کہا ہے، کہ یہ حضرات جنہوں نے مذہب کے نام پر تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی تھی وہ یہاں آکر کس کس قسم کی کوششوں میں مصروف ہیں، اس کا ملخص یہ ہے کہ یہ حضرات :-

(۱) تغیرِ نفس کے بغیر محض قوانین کی رو سے تغیرِ احوال کا دعویٰ کر رہے ہیں جو خدا کے حتمی فیصلہ کے خلاف کھلا ہوا چیلنج ہے۔

(۲) اور اسلامی قوانین کا مطالبہ اس معیار کی رو سے مرتب کرانے کا مطالبہ کرتے ہیں جو خود ان کے نزدیک ناممکن ہے۔ یعنی ایسا ضابطہ خود مرتب کر کے نہیں دیتے کیونکہ یہ جانتے ہیں کہ ایسا ہو نہیں سکتا بلکہ حکومت سے اس کا مطالبہ کرتے ہیں تاکہ اس کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کے لئے حجت موجود رہے۔

اس کا نتیجہ ملک اور قوم کی وہ حالت ہے جس پر ملت کا ہر دردمند دل خون کے آنسو بہاتا ہے، لیکن جس پر ان حضرات نے کبھی اظہارِ تأسف تک نہیں کیا کیونکہ یہ تو ان کے منشا اور مقصد کے عین مطابق ہے۔ طلوعِ اسلام نے ان کی اس اسکیم کو بھانپا اور جس طرح اس نے تحریکِ پاکستان کے خلاف ان کے ہر حربے کو بے نقاب کیا تھا یہاں بھی وہ ان کی ان تخریبی تدبیروں کی طرف سے قوم کو ہوشیار کرتا چلا آرہا ہے۔ اور اس کی سزا بھی بھگت رہا ہے۔ ان کی سوچی سمجھی اسکیم یہ تھی کہ لوگوں کے سامنے طلوعِ اسلام کو اس قدر گھناؤنی شکل میں پیش کیا جائے کہ ہر شخص اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھے اور کوئی اس کی بات نہ سنے۔ آپ کسی اجنبی سے اجنبی شخص کے سامنے بھی طلوعِ اسلام کا نام لیجئے، وہ جھٹ سے کہہ دیگا کہ "ہاں! وہ پرویزی فرقے والے جو تین وقت کی نمازیں اور رمضان کے روزے کہتے ہیں۔ نہ حج کے قائل ہیں نہ زکوٰۃ کے۔ جو شانِ رسالت تک کے منکر ہیں۔ انہوں نے تو ایک نیا مذہب ایجاد کر رکھا ہے"۔ جب ان سے پوچھا جائے کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا تو جواب میں کہہ دیں گے کہ ساری دنیا یہ کہتی ہے۔ اور ساری دنیا سے مراد ان حضرات کے پروپیگنڈے کی وہ مشینری ہے جو ان چھوٹے افسانوں کو وضع کرتی اور بے پناہ روپے کے بل بوتے پر مسلسل پھیلاتی چلی آرہی ہے۔ ان لوگوں کی اس اسکیم کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری نوجوان نسل نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ جب یہاں برائیاں بھی ختم نہیں ہوئیں اور ہر قسم کی خرابیاں بڑھتی چلی جا رہی ہیں، اور جن اسلامی قوانین کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ان کی روک تھام کر سکیں گے وہ قوانین مرتب ہی نہیں ہو سکتے۔ تو پھر ہندوستان سے کٹ کر ایک الگ مملکت بنانے کی ضرورت کیا تھی؟ جب یہ خیال اور شدت اور وسعت اختیار کر گیا تو اس کا جو نتیجہ ہوگا وہ ظاہر ہے! اور اسی نتیجے تک پہنچانا ان حضرات کا مقصود ہے جن کی مخالفت کے علی الرغم پاکستان وجود میں آگیا تھا۔

مرکزی نکتہ یہ سامنے آیا کہ "تغیرِ نفس" کے بغیر اصلاحِ احوال ناممکن ہے۔ سوال یہ ہے کہ "تغیرِ نفس" سے مراد کیا ہے؟ اس بات کو سمجھ لینے سے سارا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔

سیکولر تصورِ حیات میں اجتماعی زندگی کے لئے صرف قوانین ہوتے ہیں جنہیں افرادِ مملکت خود وضع کرتے اور عند الضرورت ان میں ترمیم و تنسیخ کرتے رہتے ہیں۔ وہ ان قوانین کو نافذ کرنے کے لئے ادارے قائم کرتے ہیں۔ پولیس، عدالتیں، جیل خانے،

اور انتہائی ضرورت کے وقت فوج ——— یہ سب انتظامات قوانین کی پابندی کرانے کے لئے ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود دنیا میں جس قدر اخلاقی برائیاں عام ہوتی اور جرائم پھیلتے چلے جا رہے ہیں وہ ڈھکی چھپی بات نہیں۔ علامہ اقبالؒ کے زمانے میں یہ "واویلا نچلے سُروں" میں تھا لیکن اب یہ ساتویں سُر سے بھی آگے بڑھ گیا ہے۔ اس میں نہ قوانین کی چنداں خرابی ہے، نہ ان کی پابندی کرانے والے اداروں کے نقائص و اسقام کی۔ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ مجرد قوانین کی رو سے انسانوں کی زندگی میں تبدیلی آ نہیں سکتی۔

قرآنی تصورِ حیات کی رُو سے وحی کی وساطت سے کچھ مستقل اقدار دی گئی ہیں جن کی پابندی سے نفسِ انسانی میں تغیر واقع ہو جاتا ہے۔ ان اقدار کو صحیح تعلیم و تربیت سے، دل کی گہرائیوں میں اس طرح راسخ کیا جاتا ہے کہ ان کی پابندی نفسِ انسانی کا اسی طرح تقاضا بن جاتی ہے جس طرح (مثلاً) سانس لینا جسمانی زندگی کا تقاضا ہے۔ حضور نبی اکرمؐ کے متعلق ارشاد ہے کہ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْهِمْ (۲/۱۲۹) یعنی حضورؐ کا فریضۂ حیات یہ تھا کہ:-

(۱) وحیٔ خداوندی کو لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ (۲) کتاب و حکمت کی تعلیم دی جائے۔

(۳) اور اس طرح لوگوں کا "تغیرِ نفس" کیا جائے۔

یعنی "تغیرِ نفس" کا ذریعہ ایسی تعلیم ہے جس میں قوانین و اقدارِ خداوندی کی غرض و غایت اور ان کا منتہیٰ و مقصود اس انداز سے دلنشیں کرایا جائے کہ اس سے انسان کی نگاہوں کا زاویہ بدل جائے۔ اس کی تطہیرِ فکر و نظر ہو جائے۔ اس میں نفسیاتی تبدیلی واقع ہو جائے۔ یہی وہ نفسیاتی تبدیلی ہو گی جس سے معاشرہ میں اصلاح ہو جائے گی۔ یہ حقیقت ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے:-

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود — جاں چوں دیگر شد، جہاں دیگر شود

طلوعِ اسلام کے سامنے یہی قرآنی حقیقت تھی جس کی رُو سے اس نے تشکیلِ پاکستان کے بعد سب سے پہلے یہ آواز بلند کی کہ اگر ہم اس خطۂ ارض کا استحکام اور اس میں اسلامی مملکت کا قیام چاہتے ہیں تو اس کے لئے کرنے کا بنیادی کام یہ ہے کہ قوم کی آنے والی نسلوں کی تعلیم قرآنی خطوط پر کی جائے۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ یہ واضح کیا جائے کہ ہم کس طرح شروع ہی سے اس مسئلہ کی اہمیت کی طرف اپنائے قوم کی توجہ منعطف کراتے چلے آ رہے ہیں۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد تیسرے یومِ آزادی کی تقریب (منعقدہ ۱۴ اگست ۱۹۵۰ء) پر ہم نے حالات کا محاسبہ کرنے کے بعد قوم سے جو کچھ کہا تھا اُسے بلفظہٖ درجِ ذیل کیا جاتا ہے۔

ہمارے نزدیک اصلاح کی وہی صورت ہے جو قرآن نے داستانِ بنی اسرائیل میں نہایت حسین انداز میں بیان فرمائی۔ بنی اسرائیل کی وہی حالت ہو چکی تھی جو آج ہماری ہے۔ مدتوں کی غلامی نے ان کے تمام درخشندہ جوہر سلب کر لئے تھے اور افسردگی اور دنائت کی تمام خرابیاں ان میں پیدا ہو چکی تھیں۔ حضرت کلیمؑ کے یدِ بیضا کی چمک انہیں فرعون کی غلامی سے نکال کر ایک آزاد خطۂ زمین میں لے آئی تھی۔ لیکن خطۂ زمین کے مل جانے سے ان کی سیرتوں میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو سکی۔ ایک چھوٹی تین تین پیغمبر ان کے اندر موجود تھے۔ حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ اور طور کی وادیوں میں حضرت شعیبؑ۔ لیکن وہ قوم جہاں تھی وہیں رہی۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ سے کہہ دیا گیا کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔ صرف اتنا انتظام کرو کہ کوئی بیرونی خطرہ اس سرزمین کی تخریب کا باعث نہ ہو جائے۔ اس دوران میں قوم کی نئی نسلوں کو اپنے ہاتھ میں لو۔ ان کی تربیت اپنے انداز سے کرو۔ چنانچہ ہوا یہ کہ ادھر مرورِ زمانہ سے یہ بوسیدہ ہڈیاں رفتہ رفتہ ختم ہوتی گئیں اور

اتنے میں وہ نوجوان تیار ہو گئے جنہیں خاص انداز میں پروان چڑھایا گیا تھا۔ یہ شاہین بچے اُبھرے اور ایک ہی جھپٹ میں اس ارضِ موعود پر قابض ہو گئے جن میں ان کے بڑے بوڑھوں کو بڑے بڑے دیو نظر آیا کرتے تھے۔ لہٰذا پاکستان والوں کیلئے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی آنے والی نسل کی صحیح تعلیم کا انتظام کریں کہ تعلیم ہی وہ قالب تیار کرتی ہے جس میں سیرتیں ڈھلا کرتی ہیں۔ آج اس بات پر نہ روئیے کہ موجودہ اوپر کا طبقہ سیرت و صلاحیت کے اعتبار سے کتنا پست ہے، نہ ہی اس پر کہ نیچے کا طبقہ ضبط و انضباط کی رو سے کس قدر خام ہے۔ رو دیئے اس بات پر کہ قوم کی آنے والی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہیں۔ حکومت کے نظم و نسق کے ہر دوسرے گوشے کی خامیوں کو برداشت کر لیا جا سکتا ہے لیکن آنیوالی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت سے متعلق گوشے کی خامیوں کو کسی صورت میں بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ اگر وہ نسل بھی ہماری موجودہ نسل کے نقشِ قدم پر چلتی رہی تو پھر یہ سرزمین ہماری ہزار آرزوؤں کے باوجود کبھی محفوظ نہیں رہ سکے گی۔ ہم لوگوں سے یہ شکایت بھی سنتے ہیں کہ ہماری حکومت تعلیم کی طرف پوری توجہ نہیں دے رہی۔ لیکن ان کی شکایت کا مطلب صرف اس قدر ہوتا ہے کہ حکومت نے کافی تعداد میں اسکول نہیں کھولے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اسکولوں میں پڑھائی اچھی نہیں ہوتی۔ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں، وہ یہ نہیں کہ آپ قریہ قریہ میں اسکول کھول دیجئے اور ہر اسکول کا نتیجہ سو فیصد دکھا دیجئے۔ اگر ایسا کر دیا جائے تو بھی ہمارے نزدیک یہ صحیح تعلیم نہیں کہلا سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں ابھی تک خواندگی (LITERACY) اور تعلیم (EDUCATION) میں فرق ہی نہیں کیا جاتا۔ ہمارے ہاں خواندگی ہی کو تعلیم سمجھا جاتا ہے۔ تعلیم کیلئے خواندگی ضروری ہے لیکن خواندگی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ زندگی ہمیشہ اقدار (VALUES) کے تابع چلتی ہے۔ اقدار ہی اس کا نصب العین متعین کرتی ہیں۔ جس قسم کی اقدار انسان کے سامنے ہونگی، اسی قسم کی اس کی زندگی ہوگی، اور جس قدر ان اقدار سے کسی کو عشق ہوگا اسی قدر سعی و کاوش اور جذب و انہماک سے ان کے حصول اور تحفظ کیلئے انسان سرگرم عمل رہے گا۔ تعلیم، زندگی کی اقدار متعین کرتی ہے جس قسم کی تعلیم ہوگی اسی قسم کی اقدار متعین ہو جائیں گی۔ صحیح تعلیم سے مفہوم یہ ہے کہ نوجوانوں کے سامنے زندگی کی صحیح اقدار لائی جائیں۔ (رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جب فرمایا کہ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ (کہ وہ انہیں نظامِ زندگی اور محکماتِ حیات کی تعلیم دیتا ہے) تو اس سے مراد نوشت و خواند کی تعلیم نہ تھی بلکہ وہی تعلیم تھی جو انسان کے سامنے زندگی کی صحیح اقدار متعین کرتی ہے اور جس کا نتیجہ انسانی صلاحیتوں کی بالیدگی (تُزَكِّيهِمْ) ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرہ میں آج جو خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے زندگی کی صحیح اقدار نہیں۔ ہمارے معاشرہ میں زندگی کی سب سے بڑی قدر انفرادی خوشحالی اور حصولِ اقتدار ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم لیٹروں کا گروہ یا چیونٹوں کا گلہ بن چکے ہیں۔ قرآن کا سب سے بڑا اعجاز یہ ہے کہ وہ زندگی کی صحیح اقدار سامنے لے آتا ہے اور یہی اقدار سیرت کی بنیادیں بن جاتی ہیں۔ چونکہ قرآن وہ اقدار متعین کرتا ہے جس سے انسانیت کی پوری پوری نشوونما ہو جاتی ہے، اس لئے جس قسم کی سیرت ان اقدار کی بنیادوں پر تشکیل ہوتی ہے، اس کی نظیر کہیں اور نہیں مل سکتی۔ یہ ظاہر ہے کہ رقبہ اور صنعت و حرفت کے اعتبار سے پاکستان دنیا کے بہت سے خطوں سے پیچھے ہے اور جس رفتار سے دنیا ترقی کر رہی ہے اس کے پیشِ نظر ہم مغربی اقوام کے ہم پلّہ نہیں ہو سکیں گے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے بلکہ ان سے آگے نکل جانے کیلئے ہمارے پاس ایک دوسرا میدان ہے اور وہ میدان ہے ان اقدار کا جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ یہ اقدار کسی اور فلسفۂ زندگی میں نہیں مل سکتیں۔ اس لئے جو کیریکٹر ان اقدار کے قالب میں ڈھلے گا اس کی قوت کا جواب دنیا میں اور کہیں نہیں مل سکے گا۔ یہ ہے وہ میدان جس میں نہ صرف یہ کہ ہم اپنی موجودہ خامیوں کو رفو کر سکیں گے بلکہ مغرب کی ترقی یافتہ اقوام سے بھی آگے بڑھ جائیں گے۔

تقسیم کے بعد قوم کو "قانونِ شریعت کو نافذ کرو" کا سلوگن دیا گیا۔ عوام کے تقلیدی ذہن نے اسے بڑا خوش آئند

سمجھا اور یہ سلوگن بڑا مقبول ہوگیا۔ اس سلوگن کے پیچھے جو جذبۂ محرکہ تھا وہ انتخابات کے قریب آنے سے بے نقاب ہوتا چلا گیا لیکن اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو بھی یہ حقیقت غور طلب تھی کہ قانونِ شریعت سے مراد کیا ہے اور اس کے نفاذ سے حاصل کیا ہوگا؟ اس چیز کو آج تک کسی نے متعین کر کے نہیں بتایا اس لئے کہ اس سلوگن کو پیش کرنے والے اس کاروباری راز (TRADE SECRET) کو عام نہیں کرنا چاہتے۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ پہلے ہمیں برسر اقتدار کر دو پھر ہم بتائیں گے کہ قانونِ شریعت کیا ہوتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ قانونِ شریعت سے مراد وہ تعزیری سزائیں ہو سکتی ہیں جو بعض جرائم کی پاداش میں نافذ کی جا سکتی ہیں، یا نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ سے متعلق مسائل۔ ذرا غور کیجئے کہ اگر ان قوانین کو نافذ بھی کر دیا جائے تو اس سے کونسی اصلاح کی صورت پیدا ہو جائیگی؟ آج بھی تو (چند مستثنات کے سوا) وہ تمام کام جرائم شمار کئے جاتے ہیں جنہیں ہماری شریعت جرائم قرار دیتی ہے اور ان جرائم کی سزائیں بھی مقرر ہیں۔ ان سزاؤں کی نوعیت میں کچھ فرق سہی لیکن بہرحال سزائیں تو موجود ہیں۔ ان سزاؤں کی موجودگی سے اصلاحِ حال کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو رہی۔ اس لئے اگر ان کی جگہ شرعی سزائیں نافذ کر دی جائیں تو پھر کونسی تبدیلی پیدا ہو جائے گی۔ بالآخر ایسے ممالک بھی تو ہیں جہاں اس قسم کا قانونِ شریعت نافذ ہے۔ وہاں کے معاشرتی حالات ہم سے کسی صورت میں بہتر نہیں۔ قرآن ایک نظامِ زندگی متعین کرتا ہے۔ اور یہ نظام متشکل نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ قوم کے دل و دماغ کی تعمیر ان خطوط پر نہ ہو جو اس نظام کے قیام اور بقاء کے ذمہ دار بن سکتے ہیں۔ اور یہ خطوط تعلیم ہی کے ذریعہ سے نمایاں ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اصل مطالبہ صحیح قرآنی تعلیم کے اجراء کا ہونا چاہیئے۔ پھر سن رکھیئے کہ قرآنی تعلیم سے مفہومِ فنِ تجوید یا قرآن کی تفاسیر پڑھانا نہیں۔ اس تعلیم سے مراد یہ ہے کہ قوم کے نوجوانوں کے سامنے وہ اقدار لائی جائیں جو قرآن متعین کرتا ہے تاریخی شواہد اور آفاقی حوادث کی روشنی میں یہ بتایا جائے کہ یہ اقدار کس طرح انسانیت کی نشوونما کا موجب بن سکتی ہیں۔ اور اس سے مختلف اقدار کیوں ایسے نتائج پیدا نہیں کر سکتیں۔ اگر ہم نے اس قسم کی تعلیم کا انتظام کر لیا تو نہ صرف یہ کہ پاکستان کا خطہ محفوظ رہ جائیگا بلکہ ہو سکتا ہے کہ نوعِ انسانی کی امامت اسی خطہ کے رہنے والوں کو نصیب ہو جائے۔

اگر قوم صحیح معنوں میں موجودہ صورتِ حالات میں تبدیلی کی خواہاں ہے تو اس کیلئے کرنے کا کام ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ ارباب نظم و نسق کو اس بات پر مجبور کر دیا جائے کہ وہ ملک میں صحیح قرآنی تعلیم رائج کریں جس سے صحیح اسلامی نظام قائم ہو سکے۔ قوم نے تین سال بے معنی کوششوں میں ضائع کر دیئے۔ اگر ہم آج بھی اپنی کوششوں کو اس ایک نقطہ پر مرکوز کر لیں تو ہماری بگڑی کو بننے کچھ دیر نہیں لگے گی۔ اگر قوم اس ضرورت سے متفق ہے تو وہ حکومت سے صحیح تعلیم کا مطالبہ کرے اور اگر حکومت اس ضرورت کا احساس رکھتی ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ یہ کام کس طرح کیا جائے تو اس باب میں ہم ہر طرح کی معاونت کے لئے تیار ہیں۔ سب سے پہلا کام مرکز میں ایک ایسی مجلس (کمیٹی) کا تعین ہے جو اس مسئلہ کی جانچ پڑتال کرے، اور اس کے بعد ملک کے لئے ایک مکمل نصابِ تعلیم تجویز کرے ــــ لیکن اگر قوم نے اس بنیادی ضرورت کا احساس نہ کیا اور اربابِ حکومت نے اپنے پیشِ نظر صرف یہی رکھا کہ عوام کو کس طرح خوش فہمیوں میں مبتلا رکھا جا سکتا ہے تو پھر زیادہ سے زیادہ ہوگا یہ کہ ایک طرف سرکاری مدارس سے کلرک پیدا ہوتے رہیں گے جو صرف روٹی کمانے کیلئے مشینوں کی جگہ کام میں لگائے جائیں گے اور دوسری طرف مذہبی علوم کے دارالعلوم کھلیں گے جن میں وہ لوگ پیدا ہونگے جنہیں روٹی کمانے کا سلیقہ بھی نہیں آئیگا۔ اور پاکستان کی حالت یہ ہوگی کہ دنیا کے دوسرے اسلامی ممالک" کی طرح اقوامِ مغرب کے رحم و کرم پر دنیا کے نقشے پر موجود رہیگا' اور جب ان کی سیاسی مصلحتوں کا تقاضا ہوگا اس نقشہ سے اس کا نام بھی مٹا دیا جائیگا۔ وَلَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَ هٰذَا۔ وَكُنْتُ نَسْيًا مَنْسِيًّا"

(طلوعِ اسلام۔ اگست ۱۹۵۰ء۔ لمعات)

اور اسے ہم بار بار دہراتے رہے ــــ ہم سمجھتے ہیں کہ قریب تیس سال کے بعد بھی اس محاکمہ میں نہ کسی تبدیلی کی ضرورت ہے نہ اضافہ کی۔ بجز اس کے کہ: ؏

آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

پاکستان میں اِسلامی قوانین

مدون کرنے کا سوال بڑی اہمیت اختیار کر رہا ہے۔ مطالبہ یہ کیا جاتا ہے کہ ان کی بنیاد "قرآن اور سنت" پر ہونی چاہیئے۔ سنت کا مسئلہ اختلافی ہے اور آج تک حل نہیں ہو سکا۔ ہمارا مؤقف یہ ہے کہ یہ قوانین اسی صورت میں مرتب ہو سکیں گے کہ قرآن مجید کو اُن کی بنیاد قرار دیا جائے۔ اس بنا پر ہم پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ قوم کو بتایا جائے کہ قرآنی قوانین کیا ہیں۔ اس فریضہ کو مفکرِ قرآن پرویز صاحب نے بطریقِ احسن سرانجام دے دیا ہے اور ایک ضابطہ مرتب کر دیا ہے۔ جس کا نام ہے :-

قرآنی قوانین

اس میں مختلف عنوانات کے تحت وہ تمام قوانین درج کر دیئے ہیں جن کا تعلق اسلامی مملکت، حکومت اور نظام سے ہو سکتا ہے۔ ہر قانون سے متعلق آیت یا آیات اور ان کا ترجمہ یا مفہوم بھی دیا گیا ہے۔ آپ سوچئے کہ اس سے اسلامی مملکت کا کتنا بڑا مسئلہ حل ہو گیا۔ اس کتاب کا :-

۱۔ مسلمانوں کے ہر گھر میں ہونا ضروری ہے تاکہ انہیں معلوم ہو کہ فلاں معاملہ میں قرآنِ کریم کا قانون کیا ہے۔
۲۔ اس کا ملک کے ہر جج اور مجسٹریٹ کی میز پر ہونا ضروری ہے۔
۳۔ ملک کے ہر وکیل (ایڈووکیٹ) کی لائبریری میں ہونا ضروری ہے۔
۴۔ لاء کالجز کے نصاب میں داخل کیا جانا ضروری ہے۔ اور
۵۔ ہر لائبریری میں اس کی موجودگی ضروری ہے۔

کتاب، اعلیٰ درجہ کے سفید کاغذ پر، آفسٹ میں چھاپی گئی ہے اور مضبوط مطلّا جلد میں محفوظ ہے۔ قیمت فی جلد بیس روپے۔ (علاوہ محصول ڈاک دو روپے)۔

واضح رہے کہ ایک عرصہ پہلے "قرآنی قوانین واقدار" کے نام سے جو کتابچہ شائع کیا گیا تھا، یہ کتاب اس سے کہیں زیادہ مفصّل ہے۔

ملنے کا پتہ: ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور — مکتبۂ دین و دانش چوک اُردو بازار لاہور

چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر،

جنرل محمد ضیاء الحق کی تقریر

چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے، ۲۵ جون ۱۹۷۸ء کی شب قوم سے خطاب کرتے ہوئے ایک تقریر نشر فرمائی۔ اس کے جو حصے اسلامی نظام و قوانین سے متعلق ہیں، انہیں ہم درجِ ذیل کرتے ہیں۔

اسلامی نظام کا مطالبہ ملک کے چاروں کونوں اور معاشرے کے تقریباً سبھی طبقوں کی طرف سے کیا جاتا ہے بار بار اسلامی نظام نافذ کرنے کا مطالبہ سن کر یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ یہ نظام شاید کبھی نافذ ہی نہیں ہوا تھا۔ (اور اگر نافذ ہوا تھا) تو عرصہ ہوا منسوخ ہو چکا لہٰذا اسے جلد از جلد دوبارہ نافذ کرنے کی ضرورت ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اسلامی زندگی کا آئین جو چودہ سو سال پہلے نافذ ہوا تھا آج بھی نافذ ہے اسے کسی نے منسوخ نہیں کیا اور نہ ہی یہ کسی ایک فرد یا گروہ کے ہاتھوں دوبارہ نافذ ہونے کا محتاج ہے۔ اگر نعوذ باللہ یہ نظام منسوخ ہو چکا ہوتا تو نماز، روزہ، حج وغیرہ کے فرائض بھی ختم ہو چکے ہوتے۔ اگر یہ نظام معرضِ وجود میں نہ ہوتا تو آج بھی لوگ پانچوں وقت اللہ کو نہ پکارتے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ نظام نہ صرف اپنی جگہ موجود ہے بلکہ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کا واحد جواز ہے۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ ہمارے اندر بے عملی کا رجحان بڑھ گیا ہے۔ کچھ لوگ تو سرے سے اسلام کو اپنی عملی زندگی سے تقریباً خارج کر چکے ہیں۔ اور جو لوگ اب تک اس پر عمل پیرا ہیں وہ بھی زیادہ تر اس کی مقررہ کردہ عبادتوں پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ اس کا سماجی، اقتصادی اور معاشرتی پہلو پس منظر میں چلا گیا ہے۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ ہمیں جو بیشتر قوانین ۱۹۴۷ء میں ورثہ میں ملے وہ ایک غیر ملکی اور غیر اسلامی حکومت کے عطا کردہ تھے۔ ہم نے ملک کا نام تو اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھ دیا اور آئین میں یہ شق بھی درج کر دی کہ قرآنِ مجید اور سنتِ رسولؐ کے خلاف کوئی قانون اس ملک میں نافذ نہیں کیا جائیگا۔ لیکن موجودہ قوانین کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ ایسا کیوں ہوا، گذشتہ تیس سال کی تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ میں تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا۔ پچھلے سال سیاسی ہنگاموں کے

دوران نظام مصطفےٰ کی حمایت میں ایک تحریک بھی چلی اور جب ۵ جولائی کو موجودہ حکومت نے اقتدار سنبھالا تو اس نے قوم کی امنگوں کے مطابق نظام اسلام نافذ کرنے کے بارے میں اپنے عزم کا اظہار کیا۔ اب تک حکومت نے اس عزم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کئی اقدامات کئے ہیں اور کئی ملکی اور غیر ملکی علماء دین سے بھی مشورہ کیا ہے وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ اسلامی نظام کو تقویت پہنچانے کے لئے بنیادی طور پر چار شعبوں میں کام کرنے کی ضرورت ہے سماجی، اقتصادی، تعلیمی اور تعزیری۔ ان شعبوں میں خاص طور پر سماجی شعبوں میں اسلام پر عمل کرنے کے لئے کسی قسم کے سرکاری احکامات کی ضرورت نہیں۔ ضابطۂ اخلاق تو پہلے ہی موجود ہے اگر سوا سات کروڑ افراد اپنی روزمرہ کی زندگی میں پانچ وقت کی نماز کی عادت ڈال لیں اور عملی زندگی میں اسلامی ضابطہ کو اپنا لیں تو عملی طور پر اسلامی نظام کا خود بخود نفاذ ہو جائے گا۔ حکومت کو ایسے قوانین بنانے ہیں جن کا تعلق افراد کی زیادہ تر اجتماعی زندگی سے ہوتا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ حکومت اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کرے گی۔ حکومت کے پیش نظر سب سے پہلے صرف ان قوانین کی نشاندہی کرنا ہے جو اسلام کی روح سے ٹکراتے ہیں۔ ان قوانین کی جگہ ایسے قوانین مرتب کرنے ہیں جو مسلمانوں کے تمام فرقوں کے لئے قابل قبول ہوں۔ یہ کام ہم مختلف کمیٹیوں، کونسلوں اور دوسرے اداروں سے کروا رہے ہیں۔ جن میں اسلامی نظریاتی کونسل مرکزی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے سپرد یہ کام ہے کہ وہ ملکی قوانین کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے کے لئے مناسب سفارشات مرتب کرے۔ یہ کام بظاہر آسان نظر آتا ہے مگر حقیقتاً بہت طویل اور مشکل ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ اس کونسل نے چند ماہ کے مختصر سے عرصہ میں بہت سے مفید کام کئے ہیں اور ملک میں صحیح معنوں میں اسلامی قوانین نافذ کرنے کے لئے ابتدائی کام کافی حد تک آگے بڑھ گیا ہے۔ کونسل کی مدد اور راہنمائی کے لئے میری درخواست پر سعودی عرب کے شاہ خالد بن عبدالعزیز اور مصر کے صدر انوار السادات نے اپنے اپنے مذہبی امور کے وزیر اور مشیر بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔ ان کے ساتھ ہی شیخ جامعہ ازہر بھی تشریف لا رہے ہیں۔ یہ معزز مہمان عنقریب پہنچنے والے ہیں اور وہ اسلامی قوانین مرتب کرنے میں ہماری مدد کریں گے۔ اسلامی قوانین کا ایک ادارہ بنائیں یا دوسرا، اسے کامیابی سے نافذ کرنے کے لئے مناسب فضا قائم کرنا ضروری ہے۔ مثلاً آپ اگر تعلیمی نظام کو ہی اسلامی رنگ میں ڈھالنا چاہیں تو صرف قوانین بنا دینا ہی کافی نہیں ہوگا بلکہ نصابی کتابوں کی تیاری، اساتذہ کی تربیت، والدین اور ان کے بچوں کی تربیت اور رضا بھی لازمی ہے۔ اور فارغ التحصیل طالب علموں کے لئے موزوں ذریعہ روزگار فراہم کرنا بھی ضروری ہوگا۔ آج عالم یہ ہے کہ جو بچے اسلامی تعلیم پر اکتفا کرتے ہیں وہ عموماً روٹی کے لئے بھی دوسروں کے محتاج ہو کر رہ جاتے ہیں۔ حالانکہ اسلام ایک ایسا نظام ہے جو محتاجی، افلاس اور استحصال کا خاتمہ کرتا ہے۔ موجودہ حکومت نے حال ہی میں مذہبی علوم کی تعلیم پانے والوں اور معروف مدرسوں سے فارغ التحصیل ہونے والے طالب علموں کے لئے معاشی اور سماجی بہبود کے اقدامات کا حکم دیا ہے لیکن معاشرے کو ایسی سطح پر لانا جہاں مذہب اور مذہب سے متعلق لوگوں کا حقیقی احترام ہو، ایک

مشکل اور صبر آزما کام ہے۔ یہی حال معیشت، معاشرت اور دیگر شعبوں میں ہے۔ اگر اس مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے سوچا جائے تو مسئلہ اسلامی نظام نافذ کرنے کا نہیں کیونکہ جیسا کہ میں نے پہلے کہا اسلامی نظام تو چودہ سو سال پہلے ہی مکمل کتاب کی صورت میں دنیا کو دیدیا گیا تھا اس میں اگر کوتاہی ہے تو ہم جیسے گنہگاروں کی جو اس پر عمل پیرا نہیں ہو سکے۔ ہمیں اپنے گریبان میں جھانکنا چاہیئے کہ ہم اس فریضہ کو ادا کرنے میں کیوں ناکام رہے۔

بعض حلقوں سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اسلامی سزائیں نافذ کرنے میں تو دیر نہیں لگتی کم از کم انہیں ہی نافذ کر دیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسلامی تقاضوں کو پورا کئے بغیر اسلامی سزائیں نافذ کرنا خود اسلام کے ساتھ زیادتی ہے کیونکہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو انسان کی معاشی، تعلیمی، عسکری، معاشرتی، غرض یہ کہ جملہ اجتماعی ضرورتوں کا احاطہ کرتا ہے اور یہ اسلامی سزائیں اسلام کے اس اجتماعی نظام کا صرف ایک حصہ ہیں سزاؤں کا نفاذ اسلام کے اجتماعی نفاذ کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ انہیں الگ طور پر نافذ کرنا مناسب نہ ہوگا۔ ورنہ لوگ یہ غلط تاثر لیں گے کہ اسلام صرف کوڑے مارنے، سنگسار کرنے اور ہاتھ کاٹنے کا نام ہے۔ بعض مفاد پرست عناصر پہلے ہی بیرونِ ملک اس قسم کا پروپیگنڈہ کر کے اسلام کے عظیم نام کو دھبہ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پاکستان کے اندر بھی بعض لوگ اور دانشور جن کی تعلیم و تربیت اور نشو و نما منفی طور پر ہوئی ہے، اسلام کو رجعت پسند سمجھتے ہیں یہ بڑی شر انگیز اور شرمناک حرکت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک نہایت مہذب، معتدل اور نرم مزاج دین ہے جس کے روحانی پہلو اس کے تعزیری پہلوؤں سے کہیں زیادہ ہیں۔ خاص طور پر سماجی انصاف اور عوام کی بہبود کا جو تصور اسلام نے پیش کیا ہے وہ دنیا کے کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتا۔

ہمارے معاشرے میں بعض خرابیاں اتنی گہری ہیں کہ ان پر نکتہ چینی کرنا تو آسان ہے مگر ان کی بیخ کنی کرنا مشکل ہے یقیناً اس میں وقت لگے گا۔ اس لئے جتنے کام ہم سے موجودہ حکومت میں ہو سکیں گے وہ ہم کریں گے انشاء اللہ اور جتنا رہ جائیگا وہ ہمیں امید ہے کہ آئندہ حکومت عوام کی امنگوں کے مطابق پورا کریگی۔ لیکن ہمارے کام سے اگلی حکومت کو یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ ابتدائی کام میں اتنی پیش رفت ہو چکی ہوگی کہ اسے آگے بڑھانے میں اُسے آسانی ہوگی۔ جو کچھ آجکل کے حالات اور مختصر وقت میں ممکن ہے ہم کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں حکومت جو اقدامات کر رہی ہے ان میں سے چند یہ ہیں۔

اولاً زکوٰۃ اور عشر کے متعلق اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات حکومت کو موصول ہو چکی ہیں ان کو اب قانونی تحفظ دینے کا جائزہ لیا جا رہا ہے جس کے بعد خصوصی طور پر قائم کئے گئے ادارے حکومت کی سرپرستی اور نگرانی میں زکوٰۃ وصول کریں گے اور اسے مستحق افراد اور اداروں پر خرچ کرنے کے لئے عملی اقدامات کریں گے۔ اس سلسلے میں بعض حلقوں میں جو قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں کہ آپکیم کے تحت شاید بینکوں میں جمع رقوم پر زبردستی زکوٰۃ لی جائے گی وہ سراسر غلط ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ تمام صاحبِ حیثیت لوگ زکوٰۃ رضاکارانہ طور پر دیا کریں گے حکومت اس سلسلہ میں رقم کو منظم طریقے سے جمع کر کے اسلامی قانون کے مطابق معاشرے کی بہبود کے لئے خرچ کریگی جن میں غربا، مساکین، یتامیٰ اور بیوائیں سرفہرست ہیں۔ یہاں یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ہماری طرف سے کوتاہی نہیں ہے لیکن میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ زکوٰۃ کا نظام جب نافذ ہو تو وہ اللہ کرے کہ کسی طرح سے بھی ناکام نہیں ہونا چاہیئے۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ اس کا طریقۂ کار احسن، اتنا مضبوط اور اتنا پرمعنی ہونا چاہیئے کہ پھر اس میں کسی قسم کی کمی کی گنجائش محسوس نہ ہو۔

(بحوالہ ہفت روزہ المنبر فیصل آباد۔ بابت ۲۸ جون تا ۴ جولائی ۱۹۷۸ء)

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

بزمِ طلوعِ اسلام لنڈن (انگلینڈ)
ہر ماہ کے پہلے اتوار کو ڈھائی بجے دوپہر (بذریعہ ٹیپ)
149 SUTTON COURT ROAD
LONDON E 13 – 9NR
PHONE 01 — 552 - 1517

لاہور میں ہر جمعہ ۸ بجے صبح (فون 880800)
۲۵/بی - گلبرگ ۲ (نزد پولیس اسٹیشن)

فیصل آباد میں ہر جمعہ ۴ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) دفتر چوہدری شاہنواز صاحب - عابد سلک انڈسٹریز (فون 30890) (عقب اڈہ لاریاں - مائی دی جھگی)

کراچی میں ہر جمعہ کو ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ)
کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام - کمرہ ۲۳ ہارون چیمبرز
الطاف حسین روڈ - نیو چالی - کراچی ۲

ملتان میں ہر جمعہ صبح ۹ بجے (بذریعہ ٹیپ)
(فون 72071) دفتر شاہ سنٹر - بیرون پاک گیٹ۔

پشاور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) برمکان، آغا محمد یونس صاحب - رفیق لین صدر - بالمقابل وی آئی پی مین گیٹ پشاور سٹیڈیم بارہ روڈ

گجرات میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ نیز ہر روز اتوار چار بجے شام
بمقام ۱۲/۱/بی - بھمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)

مردان میں ہر جمعہ بوقت ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
برمکان ڈاکٹر رضا محمد خان - نواب علی روڈ۔

جلالپور جٹاں میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ)
(گجرات) دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بازار کلاں)

راولپنڈی میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
جی ۶۶ - لیاقت روڈ

لیہ میں ہر جمعہ کے دن بعد نماز مغرب کیپٹن غلام حیدر کے مکان ۱/۳۵۱ (وارڈ ۱) واقع عقب گلی گرلز ہائی اسکول (بذریعہ ٹیپ)

کراچی کے خریدار متوجہ ہوں!

یکم اگست ۱۹۷۸ء سے کتب خانہ طلوعِ اسلام کراچی کے اوقاتِ کار حسبِ ذیل مقرر کئے گئے ہیں:-
ہر روز علاوہ جمعہ :- صبح ۱۰ بجے تا ایک بجے دوپہر
شام ۶ بجے تا ۸ بجے شب
جمعہ :- صبح ۹ بجے تا ۱۲ بجے دوپہر

محمد اسلام
کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام
کمرہ ۲۳ ہارون چیمبرز - الطاف حسین روڈ - نیو چالی - کراچی ۲

کتب خانہ میں
ادارہ طلوعِ اسلام کی جملہ مطبوعات
دستیاب ہیں اور ایک پوسٹ کارڈ تحریر کر کے منگوائی بھی جا سکتی ہیں۔

باسمہٖ تعالیٰ

اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

مقصود بالذّات کیا ہے؟

فرد ــــ یا ــــ مملکت

طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۷۴ء میں، پرویز صاحب کا خطاب جس کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے نظرِ ثانی کے بعد دوبارہ شائع کیا جاتا ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اصل مقصود کیا ہے؟

فرد ــــ یا ــــ مملکت

(طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۴ء کا خطاب)

انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا بنیادی اور اس کے ساتھ ہی مشکل ترین سوال یہ ہے کہ فرد مملکت کے لئے ہے یا مملکت فرد کے لئے۔ یعنی ان میں مقصود (END) کونسا ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ (MEANS) کونسا؟ یہی میرے آج کے خطاب کا موضوع ہے۔ وہ موضوع جس پر دنیا کے بڑے بڑے محققین نے تحقیق کی ہے، اور بڑے بڑے مفکرین نے بہت کچھ کہا ہے۔ جیسا کہ آپ حضرات کو علم ہے، میں قرآنِ کریم کا طالب العلم ہوں، اس لئے میری پیش کش کا محوری نقطہ یہ ہوگا کہ قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے۔ وبیدہ التوفیق۔

انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ یعنی اس کی زندگی کا تقاضا ہے کہ یہ دوسرے انسانوں کے ساتھ مل جل کر رہے۔ مغربی مفکر، فشٹے کے الفاظ میں ــــ "انسان، دوسرے انسانوں کے اندر رہ کر ہی انسان بن سکتا ہے"۔ ہمارا مشاہدہ بھی اس حقیقت کی تصدیق کرتا ہے۔ کسی انسانی بچے کو، اس کی پیدائش کے ساتھ ہی کسی ایسے جنگل میں چھوڑ دیا جائے جہاں کوئی دوسرا انسان نہ ہو، اور اسے کوئی جانور یا لے پوسے، تو وہ ساری عمر جانور ہی رہے گا۔ قامتِ آدمیت اختیار نہیں کر سکے گا، اگرچہ ہیکل (شکل و صورت) کے لحاظ سے وہ دوسرے آدمیوں جیسا ہی ہوگا۔ دوسری طرف، انسانی ذہن جس قدر سزائیں وضع کر سکا ہے، ان میں قید تنہائی ..... (SOLITARY CONFINEMENT) سنگین ترین اور شدید ترین سزا ہے۔ بڑے بڑے متصلب، فولادی اعصاب رکھنے والے مجرم جو سزائے موت تک سے بھی نہیں گھبراتے، قیدِ تنہائی سے چیخ اٹھتے ہیں، خواہ اس میں کوئی بدنی اذیت نہ بھی ہو۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ہم قبر کے عذاب کے تصور سے کس قدر ڈرتے، لرزتے ہیں، حشر کے عذاب کے منظر سے اس قدر نہیں کانپتے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ قبر میں مردہ تنہا ہوتا ہے۔ حشر میں ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں، انسانوں کے ساتھ۔ حتیٰ کہ کہنے والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ــــ مرگِ انبوہ جشنے دارد ــــ "آدمی، آدمی کا دارو ہوتا ہے" ــــ ہمارے ہاں کا قدیم محاورہ ہے۔ خود لفظ معاشرہ کے اندر عشر (۱۰) کا مفہوم مضمر ہے جو ایک (اکیلے) ہندسہ

کے ساتھ دوسرے ہندسہ کے ملنے سے مرتب ہوتا ہے خواہ وہ دوسرا ہندسہ، صفر ہی کیوں نہ ہو۔ جب تک ایک فرد کے ساتھ دوسرا فرد نہ ملے، معاشرہ کا وجود ہی عمل میں نہیں آسکتا۔

قبائلی زندگی

انسان کے اوّلین دورِ زندگی میں، ایک خاندان ہی اجتماعی زندگی کی بنیاد بنتا تھا۔ اس لئے خاندان کے ساتھ وابستگی، افراد کے تمدنی یا معاشرتی تقاضا کو پورا کر دیتی تھی۔ خاندان ذرا وسیع ہوا تو اس نے قبیلہ کی شکل اختیار کر لی۔ قبائلی زندگی عام طور پر خانہ بدوشی کی (NOMADIC) ہوتی تھی۔ آج یہاں، کل واں۔ بلکہ ہر صبح سفر، ہر شام سفر۔ اس لئے قبائل کے لئے علاقوں کی تخصیص کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جب انہوں نے گلہ بانی اور پھر زرعی معیشت اختیار کی تو علاقہ کی تحدید اور تخصیص کا سوال پیدا ہوا۔ یہ زمین فلاں قبیلہ کی ہے، وہ چراگاہ فلاں کی۔ اس طرح انسانی ذہن میں وہ تصور ابھرا جس نے آگے جا کر ملک یا وطن کی، شکل اختیار کر لی۔ یہ میرا وطن ہے، وہ ہمارا ملک ہے۔ کرۂ ارض پر یہ لکیریں فطرت کی کھینچی ہوئی نہیں، انسانوں کی وضع کردہ ہیں۔

اس سے پہلے تحفظِ خویش کا تقاضا، افراد کی جان (یا زیادہ سے زیادہ ان کے مال معیشی) کی حفاظت تک محدود تھا۔ اب وہ پھیل کر، وطن یا ملک کی حفاظت کو بھی محیط ہو گیا۔ یعنی اب حفاظت کا سوال، افراد کی جان مال کی حفاظت تک محدود نہ رہا، بلکہ اس سے کہیں زیادہ، ملک کی حفاظت بن گیا۔ افراد کے باہمی تنازعات کے تصفیہ اور ملک کی حفاظت کے لئے، ایک صاحبِ اقتدار اجتماعی ادارہ کی ضرورت لاینفک تھی۔ یوں حکومت یا ہیئت حاکمیہ کا تصوّر ابھرا۔ ایک عرصہ دراز تک، انسانوں کی سیاسی یا تمدنی زندگی کا تصور، ملک اور اس کی حکومت تک محدود رہا۔ لیکن اس کے بعد حکمائے یونان، بالخصوص افلاطون (PLATO) نے ایک اور تصور اجاگر کیا۔ جسے مملکت یا اسٹیٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عمومی نگاہ سے (بلکہ میرے نزدیک، فی الحقیقت) دیکھا جائے تو مملکت سوائے اس کے کیا ہے کہ ایک ملک ہے جس کے اندر ایک حکومت قائم ہے، لیکن سیاسی فلسفہ (پولیٹیکل فلاسفی) نے اس تصور پر وہ ردّے چڑھائے کہ یہ کچھ سے کچھ بن گئی۔ اس سے پہلے مسئلہ سیدھا سادہ اور صاف تھا۔ ملک سے مراد ایک خاص خطۂ زمین تھا جس کی حفاظت سے مقصود، اس ملک کے اندر بسنے والے افراد کی جان، مال وغیرہ کی حفاظت تھا۔ اور یہ مقصد ایک نظام کے تابع حاصل ہوتا تھا جسے حکومت کہا جاتا تھا۔ لیکن جب اسے مملکت یا اسٹیٹ کہہ کر پکارا گیا تو اس قسم کے سوالات پیدا ہونے شروع ہو گئے کہ مملکت اور افراد کا باہمی تعلق کیا ہے۔ اس میں مقصد کون ہے اور ذریعہ کون۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس سلسلہ میں مختلف نظریات قائم کئے گئے۔ مثلاً:-

(۱) نظریۂ وحدت (MONISTIC THEORY) اس سے مفہوم یہ ہے کہ افراد، مملکت کا جزو ہوتے ہیں۔ اپنا الگ وجود نہیں رکھتے۔

(۲) نظریۂ افرادیت (MONADISTIC THEORY) جس کی رو سے تسلیم کیا جاتا ہے کہ مملکت محض

افراد کے مجموعہ کا نام ہے۔

(۳) نظریۂ ثنویت (DUALISTIC THEORY) جس سے مفہوم یہ ہے کہ افراد کا جداگانہ وجود ہے لیکن وہ اپنی فلاح اور بہبود کے لئے مملکت یا معاشرہ (سوسائٹی) کے محتاج ہیں۔

یہاں تک تو پھر بھی خیر تھی، لیکن اس کے بعد ایک ایسا نظریہ وضع کیا گیا جس کی رو سے مملکت نے ایک مستقل بالذات حیثیت اختیار کر لی۔ اسے نظریۂ مطلقیت (IDEALISTIC THEORY) یا (ABSOLUTE THEORY) کہا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ میرے اس خطاب کا موضوع، پولیٹیکل سائنس کی رو سے نظریۂ مملکت کی وضاحت نہیں۔ میرا موضوع، فرد اور مملکت کا باہمی تعلق ہے۔ اس لئے میں، مملکت کے مختلف نظریات کے متعلق تفصیلی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ مختلف نظریات کے اس مختصر سے تعارف کے بعد اپنے موضوع کی طرف بڑھ جانا چاہتا ہوں۔ چونکہ ان نظریات میں سے، نظریۂ مطلقیت کا موضوعِ زیرِ نظر کے ساتھ بنیادی تعلق ہے، اس لئے اس سلسلہ میں ذرا تفصیل سے کام لینا ضروری ہے۔ مغربی مفکر، ہابس (HOBBES) نے اس نظریہ کا ابتدائی تصور پیش کیا تھا جب کہا تھا کہ افراد درحقیقت مملکت کے غلام ہوتے ہیں لیکن اس کی تکمیل مشہور جرمن فلاسفر ہیگل نے کی۔

ہیگل کا نظریۂ مملکت

ہیگل کے پیش کردہ تصور کی رو سے یہ کہا جاتا ہے کہ مملکت ایک زندہ، نامی وجود (ORGANISM) کا نام ہے، جو اپنی جداگانہ ہستی اور منفرد تشخص رکھتی ہے۔ ہر زندہ اور صاحبِ شعور وجود کی طرح اس کی اپنی خواہشات، اپنے جذبات اور اپنے ارادے ہوتے ہیں۔ اس کے حقوق اور اختیارات لامحدود ہیں۔ یہ اپنے معاملات میں کسی اخلاقی ضابطہ کی پابند نہیں۔ اس کی مصلحت کوشی اور حصولِ مفاد خویش، خود ایک ضابطۂ اخلاق ہے جس کے خلاف کہیں کوئی اپیل نہیں ہو سکتی۔ جب کبھی افراد اور مملکت میں اختلاف ہو تو مملکت کو ہمیشہ حق بجانب تصور کیا جائے گا۔

مملکت کے حقوق، مطلق (ABSOLUTE) ہوتے ہیں۔ مشہور، جرمن + امریکی مفکر (CASSIRER) نے ہیگل کے اس نظریہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

(STATE IS THE SELF-CERTAIN ABSOLUTE MIND WHICH ACKNOWLEDGES NO ABSTRACT RULES OF GOOD AND BAD, SHAMEFUL AND MEAN, CRAFT AND DECEPTION.
(MYTH OF THE STATE P. 264)

وہ دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سب سے اہم فریضہ مملکت کے مفاد کا تحفظ ہے۔ مملکت وہ روحِ عظیم ہے جو ساری دنیا میں حلول کئے ہوئے ہے۔ دنیا میں سنت اللہ (خدا کی روش) مملکت کی شکل میں کارفرما ہوتی ہے۔ مملکت کے متعلق بس یوں سمجھئے کہ خدا بذاتِ خود اس کے پیکر میں زمین پر اتر آیا ہے۔ جہاں تک ضوابطِ اخلاق کا تعلق ہے، مملکت صرف ایک صداقت کو تسلیم کرتی ہے۔ اور وہ صداقت ہے قوت، لامحدود قوت۔ (ایضاً ص ۲۶۵)

ہیگل نے یہ نظریہ، انیسویں صدی کے شروع میں (۱۸۰۱ء) میں پیش کیا اور رفتہ رفتہ یہ ساری دنیا میں پھیل گیا۔ (TUBINGEN UNIVERSITY) کے چانسلر (RUMELIN) نے ۱۸۷۵ء میں کہا تھا کہ:-

> مملکت اپنے اختیارات میں قادرِ مطلق واقع ہوئی ہے۔ مفادِ خویش کا تحفظ اس کا واحد فریضہ ہے۔ اس کے نزدیک اپنی قوت اور مرفہ الحالی کا حصول و استحکام، دنیائے سیاست کا بلند ترین اصول ہے اسے کسی دوسری مملکت کا خیال صرف اسی صورت میں رکھنا چاہیئے جب اس سے اس کے اپنے مفاد پر کسی قسم کی زد نہ پڑتی ہو۔ مملکت کا استحکام اور بقا، ہر قسم کی قربانی کی وجہ جواز ہے، اور ہر قسم کے اخلاقی قاعدہ اور قانون سے اعلیٰ و ارفع۔ فرد کے لئے اصولِ حیات، خود سپردگی ہے اور مملکت کے لئے تغلّبِ خویش۔
>
> (MURRAY; INDIVIDUAL AND THE STATE, P. 216)

تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اس نظریہ کی رو سے، مملکت کو خدائی اختیارات و اقتدارات کا حامل بنا دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس منہج فکر و طریق عمل کو کہا ہی (DIVINISATION OF STATE) جاتا ہے ـــــ یعنی مملکت کو الٰہ بنا دینا۔ اس طرح، مملکت ایک معبود بن جاتی ہے اور افراد، اس کے پرستار۔ یہ ایک جدید مذہب ہے جس کے اپنے اعتقادات و ضوابطِ اخلاق ہیں۔ اس مذہب میں مملکت کو خدا کا درجہ دیا جاتا ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اس نظریہ کو ہیگل نے وضع کیا تھا۔ لیکن یہ رفتہ رفتہ اس قدر عام ہوتا چلا گیا کہ اب یہ ساری دنیا کا مذہب بن چکا ہے ـــــ اصطلاحات میں فرق ہوگا۔ الفاظ بھی مختلف ہوں گے لیکن حقیقت اور روح کے اعتبار سے، اب دنیائے سیاست میں، ہر جگہ مملکت کو یہی حیثیت حاصل ہے۔ ہر جگہ اسٹیٹ کا لفظ اس طرح بولا جاتا ہے، گویا یہ سچ مچ کی کوئی جیتی جاگتی شخصیت ہے۔ جس کی حیثیت دیوی، دیوتا یا معبود کی سی ہے ـــــ عصرِ حاضر کے تراشیدہ بتوں کے متعلق جب اقبالؒ نے کہا تھا کہ ـــــ ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے ـــــ تو اس سے اس کی یہی مراد تھی۔ اس کے مقامِ الوہیت اور منصبِ معبودیت کا یہ عالم ہے کہ جب کہا جائے کہ اسٹیٹ کا یہ تقاضا ہے تو پھر کسی شخص کی مجال نہیں کہ اس پر کسی قسم کی تنقید کر سکے۔ اس کے خلاف لب کشائی کر سکے۔ اسٹیٹ کے تقاضا یا حکم کے مقابلہ میں، فرد کے کسی مفاد، مصلحت، تقاضا، آرزو، خواہش، جذبہ کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ افراد پیدا ہی اس لئے ہوتے ہیں کہ وہ مملکت کے غلام، اور اس کے تقاضوں کے روبہ عمل لانے کا ذریعہ بنیں۔ اسٹیٹ کے مقابلہ میں افراد کی اپنی ہستی کوئی نہیں ہوتی۔ ہستی صرف مملکت کی ہوتی ہے۔ اس کے لئے افراد کو ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ جب اس کا کوئی مطالبہ ہو تو فرد کا فریضہ ہے کہ اسے بلا تامل پورا کر دے۔ جو کچھ وہ مانگے اس کے حضور بلا توقف پیش کر دے، حتیٰ کہ جان تک بھی۔

گذشتہ سوڈیڑھ سو سال کے عرصہ میں، اسٹیٹ کی اس حیثیت کے متعلق اس قدر منظم پروپیگنڈہ کیا گیا ہے کہ لوگوں کے سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو چکی ہیں۔ جب کہا جاتا ہے کہ اسٹیٹ کا تقاضا یہ ہے یا اس کا حکم یہ، تو کوئی

شخص نہ اتنا سوچتا ہے، نہ پوچھتا ہے کہ وہ اسٹیٹ ہے کہاں جس نے یہ حکم دیا ہے۔ وہ رہتی کہاں ہے۔ اس کا پتہ نشان کیا ہے۔ کیا اس سے ملنے کی کوئی صورت ہو سکتی ہے جو اس سے دریافت کر لیا جائے کہ آیا یہ حکم اس نے دیا ہے؟ نہ کوئی اتنا پوچھتا ہے، نہ کوئی بتاتا۔ لیکن اسٹیٹ ہے کہ اپنے احکامات نافذ کئے جاتی ہے اور افراد آنکھیں بند کئے اس کی تعمیل کئے جاتے۔ اسٹیٹ کے معبود کا تقدس اور اس کے اقتدارِ مطلق کا تصوّر، ہر شخص کے قلب و دماغ پر چھایا رہتا ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ لوگ ہستیٔ باری تعالےٰ کے متعلق تو ثبوت مانگیں گے، لیکن مملکت کی ہستی کے متعلق نہ کوئی ثبوت طلب کرے گا نہ کسی دلیل و برہان کا تقاضا کرے گا۔ اُس کی اَن دیکھی ہستی، اور اس کے لا انتہا اختیارات کو اس طرح بلا چون و چرا تسلیم کر لیا جاتا ہے گویا وہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے جو کسی دلیل و برہان کی محتاج نہیں۔

مملکت کی حقیقت

لیکن جس ہستی کو اس طرح بلا دلیل و ثبوت تسلیم کر لیا جاتا ہے، اگر آپ ذرا ٹھنڈے دل سے تجزیہ کریں اور ان موہوم پردوں کو اٹھا کر دیکھیں تو معلوم ہے آپ کو اس کے پیچھے نظر کیا آئے گا؟ وہی جو محمود غزنوی کو سومنات کے مندر میں نظر آیا تھا۔ محمود نے جب سومنات کو فتح کیا تو اس مندر کی مورتی کے متعلق طرح طرح کے خارق عادات افسانے زبان زدِ خلائق تھے۔ ان میں سب سے زیادہ تحیر انگیز یہ تھا کہ لوگ جب اس سے اپنی مرادیں مانگتے ہیں، تو وہ ان کا جواب دیتی ہے جسے سب سنتے ہیں۔ محمود تو توحید پرست تھا، وہ ان شعبدہ بازیوں کے دامِ فریب میں کب آ سکتا تھا؟ اس نے مندر کی ہیئت کذائی پر گہری نظر ڈالی اور حقیقت کو فوراً بھانپ لیا۔ اس نے ایک ضرب سے مورتی کی پچھلی دیوار کو توڑا تو دیکھا کہ اس کے پیچھے پجاری بیٹھے ہیں جو لوگوں کی مانگ کا جواب دیتے ہیں۔ آپ جب مملکت کی مورتی کا پردہ اٹھائیں گے تو آپ کو نظر آ جائے گا کہ اس کے پیچھے چند اربابِ اقتدار بیٹھے ہیں۔ جنہوں نے زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے رکھی ہے۔ انہی کے احکام مملکت کے احکام۔ انہی کے فیصلے، مملکت کے فیصلے۔ انہی کے مفادات، مملکت کے مفاد۔ اور انہی کے تقاضے مملکت کے تقاضے بن کر سامنے آتے رہتے ہیں۔ یہ اربابِ حکومت، مملکت کے معبود کے نام پر، افرادِ معاشرہ سے اپنی پرستش کراتے ہیں۔ اس تجزیہ یعنی پردہ اٹھا دینے کے بعد، آپ دیکھیں گے کہ دنیا میں مملکت کا کوئی الگ وجود نہیں رہتا۔ یہ صرف ایک تجریدی تصوّر (ABSTRACT IDEA) بن کر رہ جاتی ہے۔ محسوس حقیقت اسی قدر ہے کہ ایک ملک ہے اور اس کے اندر ایک حکومت، یعنی اربابِ حکومت۔ آپ دیکھئے اور بار بار دیکھئے کہ ان دو محسوس چیزوں کے علاوہ اس ٹبکدہ میں آپ کو کوئی تیسری چیز نظر آتی ہے؟ اصل یہ ہے کہ دنیا میں جب ملوکیت بدنام ہوئی تو انسانوں کی ہوسِ اقتدار اور لذتِ استبداد نے ایک اور پیکر تخلیق کیا اور اس کا نام مملکت رکھ دیا۔ جو آمریت، ملوکیت کے پیکر میں بدنام ہو چکی تھی اسے اب تقدس کے اس موہوم پردے میں سند الوہیت عطا ہو گئی۔ اب نظامِ حکومت کچھ اور کیسا ہی کیوں نہ ہو، اس میں روح اسی ملوکیت کی کارفرما ہو گی۔ انسان کے دورِ جاہلیت میں، بادشاہ اپنے احکام، اپنے نام سے جاری کرتا تھا۔ اب دورِ تہذیب ہے اس لئے وہی احکام، مملکت کے نام سے جاری ہوتے ہیں۔ اُس مملکت کے نام سے جس کا، اربابِ حکومت سے الگ کوئی وجود

نہیں ہوتا۔ احکام اس زمانے میں بھی صاحبِ اقتدار کے ہوتے تھے۔ احکام اب بھی اربابِ اقتدار کے ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ جب احکام بادشاہ کے نام سے جاری ہوتے تھے تو وہ اُن کی ذمہ داری بھی قبول کرتا تھا اور رعایا بھی جانتی تھی کہ ان کا ذمہ دار کون ہے۔ اب جو احکام مملکت کے نام سے صادر ہوتے ہیں، نہ کوئی شخص ان کی ذمہ داری قبول کرتا ہے اور نہ ہی یہ متعین کیا جا سکتا ہے کہ ان کا ذمہ دار ہے کون؟ اس زمانے میں غلط احکام کی وجہ سے بادشاہ بدنام ہو جاتا تھا، اب ایسے احکام سے کوئی بدنام نہیں ہوتا کیونکہ یہ احکام مملکت کے ہوتے ہیں جس کا وجود ذہنوں سے خارج کہیں نہیں ہوتا۔ دورِ جاہلیت میں اس قسم کے موہوم صاحبِ اقتدار کو دیوی دیوتا کہا جاتا تھا، اب اسے مملکت کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ جس طرح نہ کوئی شخص دیوی، دیوتاؤں کو دیکھ سکتا تھا اور نہ ہی ان کے احکام پر کسی قسم کی تنقید کر سکتا، اسی طرح اب نہ کوئی شخص مملکت کی دیوی کو دیکھ سکتا ہے، نہ اس کے احکام پر تنقید کر سکتا۔ اس وقت افراد، "جگن ناتھ کے رتھ" کے نیچے کچلے جاتے تھے، اب ملوکیت کی دیوی کی قربان گاہ پر ذبح کر دیئے جاتے ہیں۔ مقصد اُس وقت بھی دیوی کے پجاریوں کے جذباتِ خون آشامی کی تسکین تھا۔ مقصد اب بھی وہی ہے۔ فرق صرف الفاظ اور اصطلاحات کا ہے۔ ہمارے زمانے میں الفاظ کا استعمال کیا کچھ کرتا ہے۔ امریکہ کا مشہور ماہرِ نفسیات (ERICH FROMM) اپنی کتاب (ESCAPE FROM FREEDOM) میں لکھتا ہے:-

> حقائق کو چھپانے کے لئے الفاظ کا غلط استعمال جس قدر آج کیا جاتا ہے اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ اب اپنے رفقاء سے غداری کا نام (APPEASEMENT) رکھ دیا جاتا ہے۔ فوجی جارحیت کو اپنی مدافعت (DEFENSE) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ کمزور قوموں کو محکوم بنانے کا نام "دوستی کا معاہدہ" رکھ دیا جاتا ہے اور پوری کی پوری آبادی کو وحشیانہ طریق سے مغلوب کرنے کا نام نیشنل سوشلزم۔ (P. 301)

اور ہم اس پر یہ اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ عہدِ قدیم کی ملوکیت کو مملکت کی اصطلاح میں چھپا دیا گیا ہے۔ اور اسے ایسا مبہم ہی نہیں، موہوم رکھا گیا ہے کہ اس کا کوئی واضح تصور ذہن میں آ ہی نہیں سکتا۔ اس کے باوجود، اس فریبِ تخیل کو ایسا حقیقی بنا دیا گیا ہے کہ افراد کو بلا تامل اس کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ اور یہ سب اس نظریہ کے ماتحت کہ افراد کا وجود مملکت کے قیام کے لئے ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کا ثبوت کیا ہے کہ افراد کا وجود مملکت کے قیام کے لئے ہے؟ اس کا ثبوت ہے ارسطو کی ایک تشبیہ!

تشبیہات کی شعبدہ بازی

یاد رکھئے! دنیائے انسانیت کو تشبیہات کے غلط استعمال نے جس قدر نقصان پہنچایا ہے اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ غلط تشبیہ، باطل کو حق کر کے دکھا دیتی ہے۔ بڑے سے بڑا زیرک انسان بھی نہایت آسانی سے اس کے فریب میں آ جاتا ہے۔ حقیقت چونکہ غیر محسوس ہوتی ہے اس لئے وہ آسانی سے ذہن میں جگہ نہیں پکڑتی۔ لیکن تشبیہ محسوس اشیاء سے دی جاتی ہے اس لئے وہ فوراً ذہن سے چپک

جاتی ہے۔ اگر وہ تشبیہ برحق ہے تو اس سے مجرد حقیقت آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ لیکن اگر وہ فریب انگیز ہے تو وہ حق کو باطل اور باطل کو حق بنا دیتی ہے۔ قرآنِ کریم، باعثِ فریب تخیل تشبیہات کو "شاعری" کہہ کر پکارتا ہے اور اس سے دُور بھاگنے کی تاکید کرتا ہے۔ تصوّف کا سارا کاروبار تشبیہات کے سر پہ چلتا ہے، اسی لئے شاعری اس کا سہارا بنتی ہے۔ علی حزیں نے اسی لئے تو کہا تھا کہ — تصوّف برائے شعر گفتن خوب است — ایک آدھ مثال سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔ تصوّف کا ایک عقیدہ وحدت وجود ہے۔ جس کا مفہوم (مختصر اور سیدھے سادے الفاظ میں) یہ ہے کہ کائنات میں جتنی چیزیں نظر آتی ہیں ان کا اپنا وجود کوئی نہیں۔ وجود صرف خدا کا ہے۔ خدا نے مختلف پیکر اختیار کر رکھے ہیں۔ ان چیزوں کے مختلف ناموں اور مختلف پیکروں سے ہم دھوکہ کھا جاتے ہیں ورنہ حقیقت سب کی ایک ہے۔ مذاہب کے تمام جھگڑے تنازعے بھی، ناموں کے اسی اختلاف کی وجہ سے ہیں ورنہ حقیقت ہر جگہ ایک ہی ہے۔ وہی رام ہے وہی رحیم۔ وہی بتکدہ میں ہے وہی کعبہ میں۔ ظاہر ہے کہ یہ تصور یا عقیدہ یکسر باطل ہے۔ لیکن دیکھئے کہ ایک غلط تشبیہ، اتنے کھلے ہوئے فریب کو کس قدر حقیقت بنا کر دکھا دیتی ہے۔ وہ تشبیہ یہ ہے کہ:-

گنگا ایک، گھاٹ بہتیرے کہت کبیر عقل کے پھیرے

آپ دیکھتے ہیں کہ ہزار دلائل ایک طرف اور یہ ایک تشبیہ ایک طرف۔ یہ تشبیہ اس طرح ذہن کے ساتھ چپک جاتی ہے کہ کوئی دلیل وہاں بار نہیں پا سکتی۔

یا مثلاً تصوف نے کہنا یہ ہوتا ہے کہ خدا سے براہِ راست حصولِ فیضان ناممکن ہے۔ تجلیاتِ باری تعالےٰ جب مرشد کے فیضان سے ملتی ہیں تو وہ اثر انگیز ہوتی ہیں۔ اسے تشبیہاً یوں سمجھایا جاتا ہے کہ روئی کو سارا دن دھوپ میں رکھ چھوڑیئے وہ زیادہ سے زیادہ گرم ہو جائے گی۔ لیکن اگر سورج کی انہی کرنوں کو آتشیں شیشہ میں سے گزارا جائے تو چند ثانیوں میں روئی میں آگ بھڑک اٹھے گی۔ عشقِ خداوندی کی کرنیں جب نگاہِ مرشد کے آتشیں شیشہ میں سے گذرتی ہیں تو ایک ثانیہ میں مرید کے قلب کو شعلۂ جوالہ بنا دیتی ہیں جس سے ماسوی اللہ جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔

ارسطو کی تشبیہ

یہ ہے جو تشبیہات کا غلط استعمال کرتا ہے۔ دیکھئے کہ ارسطو کی تشبیہ کس طرح اس فریب کو حقیقت بنا کر پیش کر دیتی ہے کہ ہستی صرف مملکت کی ہے، افراد کی نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ مملکت اور افراد کی مثال، انسانی جسم اور اس کے اعضاء کی سی ہے۔ اعضائے جسمانی اپنا الگ وجود نہیں رکھتے۔ وہ محض جسم کے حصے ہیں اور ان کی زندگی اور موت جسم کی زندگی کے ساتھ وابستہ ہے۔ ان کا فریضہ جسم کے لئے سامانِ زیست و صحت بہم پہنچانا ہے۔ اس سے خود ان کی زیست اور صحت کا انتظام بھی ہو جاتا ہے۔ کوئی عضو جسم سے الگ ہو کر زندہ رہ ہی نہیں سکتا۔ جسم کی مصلحت، اعضاء کی مصلحت ہے،

اس لئے جسم سے الگ اعضاء کے لئے کوئی اپنے اصول و ضوابط بھی نہیں ہو سکتے۔ نہ ہی اعضاء اپنی مرضی سے جسم کے حصے بنتے ہیں، نہ اپنی مرضی سے اس سے الگ ہو سکتے ہیں۔

اس تشبیہ کے بودا پن کے متعلق تو میں آگے چل کر بات کروں گا۔ یہاں آپ نے دیکھ لیا کہ جسم اور اعضاء کے اس رشتہ کی بنا پر، افراد کا اپنا کوئی وجود باقی نہیں رہتا۔ وہ مملکت کے قیام، استحکام اور فروغ کا ذریعہ بن جاتے ہیں اور مقصود بالذات مملکت قرار پا جاتی ہے۔ اور ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ اگر مملکت کے نظریہ کا تجزیہ کیا جائے تو وہ ان چند افراد سے الگ کوئی شے نہیں رہتی جن کے ہاتھ میں اقتدار ہو۔ یہ ایک نگاہ فریب پردہ ہے جسے ڈکٹیٹرشپ یا کلی حکومت (TOTALITARIANISM) کو چھپانے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ (جیسا کہ بتایا جا چکا ہے) اس نظریہ کو ہیگل نے وضع یا عام کیا۔ نٹشے نے پروان چڑھایا۔ ہٹلر نے اسے نازی ازم کے روپ میں ڈھالا۔ مسولینی نے فاشزم کا لبادہ اوڑھایا اور اشتراکی ممالک میں اسے عوام کی آمریت (DICTATORSHIP OF PROLETARIAT) سے تعبیر کیا گیا۔ جمہوری ممالک بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں آمریت نہیں، جمہوریت یعنی عوام کی حکومت ہے۔ لیکن یہ بھی فریب ہی ہے۔ مملکت کا تصور ان ممالک میں بھی وہی ہے جو آمریت کے حامل ممالک میں ہے۔ فرد کی ان کے ہاں بھی کوئی اہمیت نہیں۔ حال ہی میں امریکن ماہرِ نفسیات (CHARLES M. FAIR) نے ایک دقیق لیکن حقیقت کشا کتاب شائع کی ہے جس کا نام اس نے نفسِ مضمون اور عصرِ حاضر کے بدنصیب انسان کی صحیح تصویر سامنے لے آتا ہے۔ یعنی (THE DYING SELF) اس میں اس نے بتایا ہے کہ عصرِ حاضر نے فرد کی انا (I-AM-NESS) کو کچلنے کے لئے کیا کیا حربے وضع کئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ آمریت کو تو چھوڑیئے۔ اس باب میں ڈیماکریسی بھی جو گل کھلاتی ہے وہ اُس سے کم نہیں۔ اس نے اپنے اس دعویٰ کی تائید میں (DE-TOCQUEVILLE) کی کتاب (DEMOCRACY IN AMERICA) سے بہت کچھ اخذ کیا ہے۔ ایک اقتباس آپ بھی ملاحظہ فرما لیجئے۔ وہ کہتا ہے:-

> زنجیریں اور جلاد وہ کند ہتھیار تھے جنہیں مستبد قوتیں گذشتہ زمانے میں استعمال کرتی تھیں۔ یوں کہیئے کہ اُس زمانے میں، بادشاہوں نے استبداد کو مادی شکل دے رکھی تھی۔ لیکن دورِ حاضر کی جمہوریت نے اسے یکسر ذہنی مسئلہ بنا دیا ہے۔ اب آقا یہ نہیں کہتا کہ تم وہی سوچو جو میں سوچتا ہوں ورنہ تم قتل کر دیئے جاؤ گے۔ اب وہ کہتا ہے کہ تمہیں اس کی آزادی حاصل ہے کہ تم میری فکر سے الگ فکر رکھو۔ اس اختلاف کے باوجود تمہاری جان، مال اور دیگر مقبوضات سب محفوظ رہیں گی۔ صرف اتنا ہوگا کہ تم خود اپنوں میں اجنبی بن کر رہ جاؤ گے۔ تم انسانوں کے ساتھ رہو گے لیکن انسانی حقوق سے محروم کر دیئے جاؤ گے۔ تمہارے ہم جنس تم سے اسی طرح نفرت کرنے لگ جائیں گے جس طرح کسی نجس شے سے نفرت کی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ بھی جو تمہیں معصوم اور بے قصور جانتے ہیں تم سے قطع تعلق کر لیں گے کہ لوگ کہیں ان سے بھی نفرت نہ کرنے لگ جائیں (ان سے یہ آقا کہتا ہے) جاؤ! امن میں رہو۔ میں نے تمہیں تمہاری زندگی بخش

دی ہے۔ لیکن یہ زندگی وہ ہے جو موت سے بھی بدتر ہے۔

(THE DYING SELF . P. 185)

یہ ہوتی ہے فرد کی حالت جمہوریت میں۔ اس میں اکثریت کا ساتھ چھوڑ کر فرد ایسا شجرِ ممنوعہ (WET PAINT) بن جاتا ہے کہ کوئی اس کے پاس تک آنا نہیں چاہتا۔ وہ بھری دنیا میں تنہا رہ جاتا ہے۔ بستے رستے معاشرے میں افراد کس قدر تنہا رہ جاتے ہیں، اس کا اندازہ اس کتاب کے ٹائیٹل سے لگ سکتا ہے جو آج سے چند سال ادھر امریکہ کے دو صحافیوں نے مرتب اور شائع کی تھی اور جس میں کوائف و شواہد اور اعداد و شمار سے بتایا گیا تھا کہ امریکی معاشرہ کی حالت کیا ہے۔ کتاب کا ٹائیٹل تھا (THE LONELY CROWD) ایسے معاشرہ میں فرد بے شک دوسرے افراد کے ساتھ رہتا ہے لیکن اس طرح جس طرح کسی مشین کا ایک پرزہ دوسرے پرزوں کے ساتھ رہتا ہے۔ موضوعِ زیرِ نظر کے سلسلہ میں (ERICH FROMM) اپنی کتاب (ESCAPE FROM FREEDOM) میں (جس کا ایک اقتباس پہلے بھی پیش کیا جا چکا ہے) لکھتا ہے:۔

جو شخص اپنی انفرادیت کھو کر سوسائٹی کی مشینری کا پرزہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اس قسم کا پرزہ جس قسم کے اور ہزاروں پرزے اس کے گرد و پیش ہوتے ہیں، وہ تنہا تو بے شک نہیں رہتا اور خطرات سے بھی مامون ہو جاتا ہے، لیکن اس کے لئے اسے جو قیمت ادا کرنی پڑتی ہے وہ بہت زیادہ ہے۔ یعنی اپنا تشخص، اپنی انفرادیت، اپنی ذات، اپنا (SELF)۔ (P. 209)

وہ اپنی ایک اور کتاب (THE REVOLUTION OF HOPE) میں لکھتا ہے:۔

جس معاشرہ میں انسان کو (DE - HUMANISED) کر دیا جائے، یعنی لباسِ آدمیت سے عاری۔ اس میں سیاسی آزادی، آزادی نہیں رہتی، غلامی بن جاتی ہے۔

(P. 91)

یہی مصنف آگے چل کر لکھتا ہے:۔

مملکت کا فریضہ، انسانی زندگی کا احترام ہے۔ مثبت عمل یا عملِ خیر وہ ہے جو فرد کی مضمر صلاحیتوں کی نمود میں معاون ہو۔ اور منفی یا عملِ شر وہ جو زندگی کا گلا گھونٹ دے، اور انسانی سرگرمیوں کو مفلوج کر دے۔ (P. 93)

(ERNST CASSIRER) اپنی آخری تصنیف (THE MYTH OF THE STATE) میں فرد اور مملکت کے حقوق پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے کہ مملکت کے جتنے حقوق اور اختیارات جی چاہے وضع کر لیجئے لیکن فرد کا ایک ایسا حق ہے جس سے اسے کوئی مملکت کسی صورت میں بھی محروم نہیں کر سکتی۔ اور وہ ہے اس کا حقِ انفرادیت (THE RIGHT TO PERSONALITY) مملکت کا فرد کو اس حق سے محروم کر دینا تو ایک طرف، خود فرد کو بھی اس کا حق حاصل نہیں کہ اپنے اس حق سے دستبردار ہو جائے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو اس نے اپنے تشخص کو ختم کر دیا۔ اپنی انسانیت

کو تباہ کر دیا۔ (P. 175)

پروفیسر (I. Mc IVER) اپنی کتاب (THE MODERN STATE) میں مملکت کے حقوق و اختیارات پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

مملکت، حکمران اس لئے ہوتی ہے کہ وہ افراد کی خدمت گذار ہوتی ہے۔ وہ ملک کی دولت اپنے قبضہ میں اس لئے رکھتی ہے کہ اس سے اس نے افراد کا فرضہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ وہ حقوق کی تخلیق کرتی ہے۔ لیکن اس طرح نہیں کہ وہ مسندِ عالی پر بیٹھ کر خیرات بانٹتی ہے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ تخلیقِ حقوق کے لئے معاشرہ کی ایجنٹ ہوتی ہے۔ یاد رکھئے! افراد آقا ہوتے ہیں اور مملکت خادم۔ اور یہ ظاہر ہے کہ خادم، اپنے آقا سے بڑا کبھی نہیں ہو سکتا۔ جس طرح انسانی حقوق ان کے فرائض کی نسبت سے متعین اور محدود ہوتے ہیں، اسی طرح مملکت کے حقوق کو (اس کی ذمہ داریوں کی نسبت سے) اضافی اور محدود ہونا چاہیئے۔ (P. 480)

اور یہیں سے ارسطو کی اس تشبیہ کا کھوکھلا پن واضح ہو جاتا ہے جس کے زور پر اس نے مملکت کو مقصد اور افراد کو ذرائع قرار دیا تھا ــــ یعنی جسم اور اعضاء کی تشبیہ۔

ارسطو کی تشبیہ کا کھوکھلا پن

اس نے یہ کہا ہے کہ وجود صرف جسم کا ہوتا ہے، اعضاء اپنا الگ وجود نہیں رکھتے۔ یہ دعویٰ حقیقت کے خلاف ہے۔ وجود دراصل اعضاء اور جوارح کا ہوتا ہے۔ جسم کا کوئی الگ وجود نہیں ہوتا۔ جسم تو اعضاء و جوارح کے ایسے مجموعے کا نام ہوتا ہے جن میں باہمی ربط و ضبط اور تعاون و تناصر ہوتا ہے۔ آپ مختلف اعضاء ٹانگیں، بازو، دھڑ، سر وغیرہ کو الگ کرتے جائیے۔ وہ تو الگ الگ پڑے دکھائی دیں گے۔ لیکن جسم غائب ہو جائے گا۔ جسم کا وجود محض ذہنی اور تصوّراتی ..... (CONCEPTUAL) ہوتا ہے۔ وہ موجود فی الخارج نہیں ہوتا۔ صحت، مختلف اعضاء و جوارح کی صحیح حالت کا نام ہے اور جب کوئی ایک عضو یا بعض اعضا اپنی صحیح حالت میں نہیں رہتے۔ اور اس طرح اپنا فریضہ سرانجام نہیں دیتے تو اُسے بیماری کہا جاتا ہے۔ اگر کوئی عضو زہر آلود ہو جائے تو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جسم کی حفاظت کے لئے اس کا کاٹ پھینکنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ایسا محض اس لفظ (جسم) کے عام استعمال کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ ورنہ، درحقیقت کہنا یہ چاہیئے کہ اس عضو کو، دیگر اعضا کی صحت اور سلامتی کے لئے کاٹ پھینکنا ضروری ہے۔ اس سے واضح ہے کہ افراد اپنا الگ تشخص اور وجود رکھتے ہیں۔ اور کوئی مملکت وجود میں نہیں آ سکتی۔ جب تک افراد پہلے سے موجود نہ ہوں۔ مملکت نہ ہو تو افراد پھر بھی باقی رہ سکتے ہیں، اور رہتے ہیں، لیکن افراد نہ رہیں تو مملکت کا تصوّر تک بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جب افراد باہمی رضامندی سے، باہمد گر ربط و

ضبط اور تعاون و تناصر کی زندگی بسر کرنے کا عزم کر لیں اور اپنے حفظ و بقا کے لئے قوت فراہم کر لیں تو ان کے اس اندازِ زیست کو معاشرہ (سوسائٹی) یا مملکت سے تعبیر کیا جائے گا۔ یہ تشبیہ (کہ افراد اعضاء ہیں، اور مملکت جسم) درحقیقت افلاطون (PLATO) کے نظریۂ ابدی تقسیم کے لئے وضع کی گئی تھی۔ اس کے نظریہ کی رو سے غلام ساری عمر غلام رہتا ہے اور حکمران طبقہ (جنہیں وہ GUARDIANS) کہہ کر پکارتا تھا) ساری عمر حکمران۔ اور اس کی مثال جسم کے اعضا کی سی ہے۔ پاؤں ہمیشہ پاؤں رہتا ہے اور سر ہمیشہ سر۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ پاؤں اپنی صلاحیتوں کو بڑھا کر سر کی جگہ لے لے اور سر کو پاؤں کی جگہ رکھ دیا جائے۔ ہر عضو کا اپنا اپنا مقام ہے جو پیدائش کی رُو سے متعین ہوتا ہے اور اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کسی عضو کو نہ اس کی آرزو کرنی چاہیئے کہ میں فلاں عضو بن جاؤں، نہ ایسی کوشش ــــ نہ ہی پست اعضاء کو اپنی پستی کے احساس سے، اپنے فرائض مفوضہ چھوڑ کر، سرکشی پر اتر آنا چاہیئے۔ افلاطون نے اس تشبیہ سے، طبقات کی تقسیم کو پیدائشی اور غیر متبدل قرار دے دیا، اور ارسطو نے اس تشبیہ سے افراد کو مملکت کا غلام بنا کر رکھ دیا۔ آپ نے دیکھا کہ تشبیہات کے غلط استعمال سے کس طرح حق کو باطل اور باطل کو حق بنا کر دکھا دیا جاتا ہے۔ اسے اقبالؔ حکمران کی ساحری سے تعبیر کرتا ہے۔

ارسطو نے یہ تشبیہ مہیا کی اور ہیگل نے اس پر سیاست کی پوری عمارت استوار کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب دنیا میں ہر جگہ آمریت کا نظام قائم ہے، خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ دیا جائے۔ اس اعتبار سے ڈکٹیٹر شپ اور مغربی ڈیماکریسی (جمہوریت) میں کوئی فرق نہیں ؎

ہے وہی سازِ کہن، مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

اور ــــ ؎

خواب سے بیدار ہوتا ہے کبھی محکوم اگر
پھر سُلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

حکمران کا یہ سحر، مملکت کے موہوم تصور کی رو سے کارفرما ہوتا ہے۔ جسے مقصود بالذات اور افراد کو اس کے مقاصد کے حصول کا ذریعہ قرار دیا جاتا ہے۔ (ERICH FROMM) ڈکٹیٹر شپ اور صحیح جمہوریت کے فرق کو ان الفاظ سے واضح کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

ڈیماکریسی اس نظام کا نام ہے جس میں ایسے معاشی، سیاسی اور ثقافتی حالات پیدا کئے جاتے ہیں جن میں فرد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے برعکس، فاشزم اس نظام کو کہتے ہیں ــــ خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے ــــ جس میں فرد کو خارجی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنا لیا جاتا ہے اور

اس کی مضمر صلاحیتوں کو ابھرنے نہیں دیا جاتا۔

(ESCAPE FROM FREEDOM P. 301)

برگسان اس اہم نکتہ کی تشریح ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

مملکت کا اقتدار انسانوں پر نہیں، چیزوں پر ہونا چاہیئے (اور وہ بھی اس طرح کہ) کسی انسان کا دوسرے انسان پر کوئی اقتدار نہ رہے۔

(THE TWO SOURCES OF RELIGION AND MORALITY. P 300)

ہوسِ اقتدار

(CASSIRER) کہتا ہے کہ مملکت کا یہ کلی، آمرانہ، ہمہ گیر، مستبدانہ نظریہ لوگوں کی ہوسِ اقتدار (LOVE FOR POWER) کا وضع کردہ ہے۔ اس ہوس کے متعلق وہ لکھتا ہے:۔

ہم دنیا میں کوئی آرزو، محض آرزو کے لئے نہیں کرتے۔ ہر آرزو کسی مقصد کے حصول کے لئے ہوتی ہے اور جب وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے تو اس سے اُس آرزو کی تسکین ہو جاتی ہے لیکن اقتدار ایک ایسی آرزو یا خواہش ہے جو کسی مقصد کے حصول کی خاطر نہیں ہوتی۔ یہ اپنا مقصد آپ ہوتی ہے اس لئے ناقابلِ تسکین ہوتی ہے۔ اس میں کبھی اطمینان اور سکون حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ ایسی (جھوٹی) پیاس ہوتی ہے جو کبھی بجھتی نہیں۔ جو لوگ اس مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں، ان کی مثال ایسے شخص کی سی ہوتی ہے جو چھلنی میں پانی ڈالے چلا جاتا ہے چھلنی میں عمر بھر پانی ڈالتے جایئے وہ کبھی بھر نہیں سکتی۔ افلاطون اس مرض کو جوع الکلب (کتے کی بھوک) کہہ کر پکارتا ہے۔ ھل من مزید کی ہوس تمام پیمانوں کو توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ اور چونکہ افلاطون کے نزدیک ـــــ پیمانے یا صحیح تناسب ہی پبلک یا پرائیویٹ زندگی کی صحت کا معیار ہوتے ہیں، اس لئے ظاہر ہے کہ ہوسِ اقتدار کی پیمانہ شکنی اور معیار فراموشی غالب آ جائے تو اس کا نتیجہ، فساد اور تخریب کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ افلاطون کے نزدیک، عدل اور ہوسِ اقتدار دو متضاد نقاط ہیں جو کبھی یک جا نہیں ہو سکتے۔

(THE MYTH OF THE STATE. P.74-75)

اور جب اس ہوسِ اقتدار کو "مفادِ مملکت" کے مقدس نقاب میں چھپا دیا جائے تو ان ہوس پرستوں کے دل میں ضمیر کی ملامت کی وہ خلش بھی باقی نہیں رہتی جو برہنہ استبداد کی صورت میں اکثر ابھر آتی ہے۔ آپ دوسرے انسانوں کو اپنے جذبۂ انتقام کی تسکین کا سامان بنایئے اور اس طرح ان پر تشدد کیجئے تو (اگر آپ کا اپنا ضمیر مردہ بھی ہو چکا ہو تو کم از کم) دوسرے لوگ اس کے خلاف آواز اٹھائیں گے لیکن جب یہ کہہ دیا جائے کہ ایسا کرنا مملکت کے مفاد کا تقاضا ہے تو نہ صرف یہ کہ اس کی مخالفت کہیں سے نہیں ہوگی بلکہ عام طور پر اس کی تائید ہوگی۔ اور آپ کو محبِ وطن اور بہی خواہِ مملکت کا سارٹیفکیٹ بھی

مل جائے گا۔ اور تماشہ یہ کہ کوئی شخص آپ سے یہ نہیں پوچھے گا کہ ایسا کرنا واقعی مملکت کے مفاد کا تقاضا ہے۔ اگر کوئی شخص ایسی آواز اٹھائے تو اسے یہ کہہ کر دبا دیا جاتا ہے کہ اس راز کا انکشاف مفادِ مملکت کے خلاف ہے۔ حالانکہ جیسے کہ پہلے کہا جا چکا ہے، مملکت کا وجود ہی موہوم ہوتا ہے۔ اگر اس فریبِ تخیل کو مٹا کر بات صاف کی جائے تو انسانوں کے اجتماعی نظام کا مقصود و معیار، افراد کا مفاد قرار پا جائے گا۔ یہ عیار ایسا محسوس ہے جس میں نہ کسی کو دھوکا دیا جا سکتا ہے، نہ کوئی دھوکا کھا سکتا ہے لیکن مملکت کا یہ نظریہ عجیب طرفہ تماشا ہے۔ اس میں مملکت خوشحال (PROSPEROUS) ہوتی جاتی ہے اور افراد مفلوک۔ مملکت طاقتور ہوتی جاتی ہے اور افراد کمزور اور ناتواں۔ مملکت کی دولت بڑھتی جاتی ہے اور افراد، غریب سے غریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ (ارسطو کی فریب انگیز تشبیہ کے مطابق) اعضاء سوکھ کر کانٹا ہوتے جاتے ہیں لیکن جسم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ تنومند اور توانا ہو رہا ہے۔ انہیں ایک ایک کر کے کچل یا کاٹ دیا جاتا ہے اور سمجھایا یہ جاتا ہے کہ اس سے جسم کی نشوونما ہو رہی ہے۔ یہ نشوونما، مرفہ الحالی، تنومندی، توانائی، درحقیقت ان چند افراد کی ہوتی ہے جن کے ہاتھ میں اقتدار ہوتا ہے۔ (جیسا کہ بتایا جا چکا ہے) "مملکت" درحقیقت انہی کا نام ہوتا ہے۔ اس کا الگ وجود ہی نہیں ہوتا۔ اگر آپ نے اس "عنقا" کا وجود تسلیم ہی کرنا ہے تو اس حقیقت کو خود بھی تسلیم کیجئے اور دوسروں سے بھی تسلیم کرائیے کہ مملکت کی مرفہ الحالی اور ضعف و ناتوانی کے ماپنے اور پرکھنے کا معیار افرادِ مملکت ہیں۔ اگر افراد خوشحال، تنومند و توانا اور بے خوف و خطر ہیں تو مملکت بھی خوش حال اور طاقتور ہے۔ اگر افراد سقیم الحال اور ہر وقت خوف و حزن کے احساس کا شکار ہیں، تو مملکت سوختہ بخت اور بدحال ہے۔ جیسا اقبالؒ نے کہا تھا کہ: ؎

ہر فرد ہے ملّت کے مقدر کا ستارہ

تو اس سے اس کی یہی مراد تھی۔ ملّت کا مقدر، افراد کی حالت سے ماپا جانا چاہیئے۔

تصریحاتِ بالا سے ہم نے دیکھ لیا کہ انسان کی ہوسِ اقتدار نے مملکت کا موہوم بت تراش کر استبداد کی کتنی راہیں کشادہ کر لیں اور انہیں کس طرح حق بجانب قرار دے لیا۔ انسانیت کا کتنا قیمتی خون ہے جو اس کالی دیوی کے استھان کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ بنی آدم کی کس قدر سوختنی قربانیاں ہیں جن سے اس بھیروں ماتا کی خوئے درندگی (SADISTIC NATURE) کی تسکین کا سامان فراہم کیا جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ تھیاکریسی میں جو کچھ ارباب کلیسا خدا کے نام سے کرتے تھے سیکولرازم میں وہی کچھ مملکت کے نام سے کیا جاتا ہے۔ نہ اس میں کوئی خدا سے پوچھ سکتا تھا کہ ہمارے سامنے جو آپ کے نام پر کیا جاتا ہے، کیا وہ واقعی آپ کا مطالبہ ہے۔ نہ ہی کوئی مملکت کی دیوی سے دریافت کر سکتا ہے کہ جن قربانیوں کا تقاضا ہم سے کیا جاتا ہے کیا وہ آپ ہی کا ارشاد ہے؟ تھیاکریسی کا خدا بھی محض ذہنی اور قیاسی تھا۔ مملکت کا معبود بھی محض ذہنی اور خیالی۔ وہ بھی "پجاریوں" کا وضع کردہ نقابِ فریب پرور، یہ بھی "مہاجنوں[1]" کا بُنا ہوا پردۂ سحر انگیز۔ فرق دونوں میں صرف اتنا ہے کہ وہ۔

---

[1] مہا + جن۔ بڑے بڑے قوی ہیکل جنات۔ یعنی ارباب اقتدار۔

(دورِ جہالت کی) کھڈیوں کا بُنا ہوا تھا اس لئے (COARSE) اور (THREAD-BARE) تھا۔ یہ تہذیبِ حاضر کی مشینوں کا ساختہ پرداختہ ہے اس لئے ایسا نفیس و لطیف کہ اس کے پیچھے چھپے ہوئے فریب کی طرف کسی کی نگاہ نہیں جاتی۔

قرآن کا پیغامِ حقیقت کشا

قرآن آیا اور اس نے ذہنِ انسانی کے تراشیدہ تمام بتوں کو حریمِ انسانیت سے نکال کر باہر کیا۔ قرآن، ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا پورا نظام سامنے لاتا ہے لیکن آپ یہ معلوم کرکے حیران ہوں گے کہ اس میں مملکت کا لفظ تک نہیں ملتا۔ اس لئے اس ہیئتِ اجتماعیہ کے دو ہی اجزا بتائے ہیں ـــــ ایک، ملک یعنی ایک خطۂ ارض اور دوسرا جزو، اس ملک میں بسنے والے انسان ـــــ ملک کا تعین بھی وہ اپنے پروگرام کے ابتدائے کار کے لئے کرتا ہے۔ یعنی وہ اپنے پروگرام کا آغاز ایک خطۂ ارض سے کرتا ہے اور یہی اس کا ممکن العمل اور آسان طریقہ ہے ورنہ اس کے سامنے اس پروگرام کے منتہیٰ کے طور پر، پورے کا پورا کرۂ ارض ہوتا ہے۔ وہ ساری دنیا میں اس نظام کو پھیلا دینا چاہتا ہے۔ وہ اس خطۂ ارض کو (جس نے اس کے پروگرام کی اولین تجربہ گاہ بننا ہے) محفوظ رکھنے کی تاکید کرتا ہے کہ جبتک یہ محفوظ نہیں ہوگا، اس تجربہ پر امن و سکون سے عمل نہیں ہو سکے گا۔ وہ اس کی بھی تاکید کرتا ہے کہ اس خطہ (ملک) کی آفاتِ ارضی و سماوی سے بھی حفاظت کا انتظام کیا جائے۔ وہ جب بتاتا ہے کہ اقوامِ گذشتہ کے مساکن کس طرح سیلابوں، آندھیوں، زلزلوں، آتش فشاں پہاڑوں یا پانی کے بندوں (DAMS) وغیرہ کی شکست و ریخت سے تباہ ہو گئے تو اس سے یہی کہنا مقصود ہے کہ تم اپنے ملک کو اس قسم کے حوادث سے محفوظ رکھنا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بیرونی جارحیت سے حفاظت کی تاکید یہ کہہ کر کرتا ہے کہ:۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ۔ (۸/۶۰)

"تم اپنے ملک کی سرحدوں کو امکان بھر مضبوط رکھو۔ ایسا مضبوط کہ تمہارے اور تمہارے دین کے دشمن اس کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی بھی جرأت نہ کر سکیں ـــــ وہ دشمن بھی جو تمہاری نگاہوں کے سامنے ہیں اور وہ بھی جو سرِ دست تمہاری نظروں سے اوجھل ہیں۔ اس مقصد کے لئے تم جو کچھ بھی صرف کرو گے وہ تمہارے ہاتھ سے جاتا نہیں رہے گا، لوٹ کر واپس آجائے گا۔ اس میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں ہوگی۔"

مملکت ایک موہوم تصور تھا۔ اس کے مقابلہ میں ملک ایک محسوس خطۂ زمین کا نام ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ملک خطرہ میں ہے تو اس خطرہ کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے متعلق نہ کوئی دھوکا دے سکتا ہے، نہ دھوکا کھایا جا سکتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس خطرہ کی نوعیت یا کمیت کا اندازہ اُن

معلومات کی بنا پر لگایا جا سکتا ہے جو کسی کو حاصل ہوں۔ لیکن اس کا تعلق بہرحال محسوسات سے ہوتا ہے۔ مملکت کی طرح موہوم نہیں ہوتا۔

مقصود بالذّات کون ہے؟

لیکن ملک کی حفاظت کی اس قدر تاکید کے باوجود، قرآن کریم اسے بھی مقصود بالذات قرار نہیں دیتا بلکہ ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ اُسی طرح، جیسے ایک مکان (گھر) کا وجود مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ وہ افرادِ خانہ کے لئے رہائش گاہ ہوتا ہے۔ اگر مکان میں مکین نہ ہوں تو وہ ویرانہ بن جاتا ہے۔ مقصود بالذات مکان نہیں، مکان کے مکین ہوتے ہیں۔ مکان اس کے مکینوں کے مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے۔ مکان مضبوط ہوتا ہے تو اس سے مکان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اس کے مکین محفوظ اور مطمئن ہوتے ہیں۔ مکان گرتا ہے تو اس سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ خانماں خراب اس کے مکین ہوتے ہیں قرآن کے نزدیک، مقصود بالذات، نہ مملکت ہے، نہ ملک۔ مقصود بالذات افراد ہیں ـــــ حتیٰ کہ اس کے نزدیک خارجی کائنات کا وجود بھی مقصود بالذات نہیں۔ یہ سب انسان کے فائدے کے لئے ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ: هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا۔ (۲/۲۹) "کرۂ ارض میں جو کچھ ہے، اُسے خدا نے تمہارے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے۔ صرف ارض ہی نہیں" وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔ (۴۵/۱۳) "ارض و سمٰوٰت میں جو کچھ ہے، سب کا سب، خدا نے تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے"۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

اور یہ کہ ؎

ہے گرمیٔ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم، سورج بھی تماشائی، تارے بھی تماشائی

یہ تو رہا انسان اور کائنات کا تعلق۔ لیکن ہمارے موضوعِ زیرِ نظر کی رو سے، سوال انسان اور انسان کے باہمی تعلق کا ہے۔ یہی وہ انسانوں کا باہمی تعلق ہے جس سے تہذیب، تمدن، معاشرت، سیاست کے تصورات جنم لیتے اور مختلف نظام اور ضوابط وجود میں آتے ہیں۔ میں نے ابھی ابھی بتایا ہے کہ قرآن کریم میں مملکت کا نام تک نہیں آیا۔ ملک کا تصور ضرور دیا گیا ہے۔ اور ملک کے اندر حکومت کا تصور بھی۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جس چیز کو ہم نے مملکت کے نظریہ کی خرابی کہا ہے وہ درحقیقت نظامِ اقتدار کی خرابی ہے۔ قرآن نے نظامِ اقتدار کو حکومت کہہ کر پکارا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن نظامِ اقتدار یا نظامِ حکومت کا کس قسم کا تصور دیتا ہے اور اس میں فرد کی حیثیت اور مقام کیا متعین ہوتا ہے۔

نظامِ حکومت کا قرآنی تصوّر

دنیا کا کوئی نظامِ حکومت بھی لیجئے، اس میں کسی نہ کسی شکل میں، بعض انسانوں کا دوسرے انسانوں پر اقتدار ضرور قائم رہتا ہے۔ قرآن کریم اس تصور کو وجہِ تذلیلِ انسانیت قرار دیتا ہے کہ کسی انسان کا دوسرے انسان پر اقتدار ہو۔ وہ اسے مساواتِ انسانیہ کے خلاف اور احترامِ آدمیت کے منافی ٹھہراتا ہے۔ وہ انسانوں کی انسانوں پر حکومت کے تصور کو باطل قرار دیتا ہے۔ کیونکہ اس سے فرد اس آزادی سے محروم ہو جاتا ہے جو اُسے انسان ہونے کی حیثیت سے حاصل ہونی چاہیئے۔

لیکن نظامِ حکومت کے بغیر تو مدنی الطبع انسان کا معاشرہ قائم نہیں رہ سکتا۔ اس سے یہ سوال سامنے آئے گا کہ قرآن، اس مسئلہ کا حل کیا بتاتا ہے۔ وہ اس کا حل یہ بتاتا ہے کہ انسانوں پر حقِ حکومت کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کو حاصل نہیں۔ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ اس سے ذہن فوراً اس طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ اس طرح تو پھر پھرا کر ہم وہیں جا پہنچے جہاں ہم تھیاکریسی یا مملکتی تصوّر کے گرداب میں پھنسے ہوئے تھے۔ وہاں بھی حقِ حکومت ان قوتوں کا بتایا جاتا تھا جن کا تعلق عالمِ محسوسات سے نہیں، یہاں بھی انسانوں کو اس ہستی کے زیرِ اقتدار لایا جاتا ہے جسے وہ نہ دیکھ سکتے ہیں، نہ اس کی بات سن سکتے ہیں، نہ اس سے کچھ کہہ سکتے ہیں، نہ یہ پوچھ سکتے ہیں کہ جو کچھ ہم سے کہا جاتا ہے کیا وہ آپ کا ارشاد ہے، اور جو کچھ ہم سے مانگا جاتا ہے، کیا وہ آپ ہی کا مطالبہ ہے؟ یہ سوال بڑا معقول ہے، لیکن اس کا جواب معقول تر۔ وہ کہتا ہے کہ اس نظامِ حکومت میں بے شک تمہارا تعلق ایک غیر محسوس، غیر مرئی ہستی (خدا) سے ہوتا ہے لیکن اس نے اپنے نظامِ حکومت کے لئے ایک ضابطہ، قوانین و اقدار دے دیا ہے جو محسوس بھی ہے اور مرئی بھی۔ اُسے تم دیکھ سکتے ہو، پڑھ سکتے ہو، سمجھ سکتے ہو، خدا کی حکومت سے مراد اِس ضابطہ، قوانین و اقدار کی اطاعت ہے۔ یہ ضابطہ مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔ اس لئے اس میں نہ کوئی مذہبی پیشوائیت کسی قسم کا حک و اضافہ کر سکتی ہے، نہ کوئی سیاسی اعتبار سے ذی اقتدار، کسی قسم کا تغیر و تبدل۔ خدا نے اور تو اور، خود رسول اللہ سے بھی کہہ دیا کہ: فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ۔ (۵/۴۸) ان لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کرو۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہ اس بات کا اعلان کر دو کہ: مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ۔ (۱۰/۱۵) "مجھے اس کا کوئی اختیار نہیں کہ میں اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کر سکوں"۔ کتنا بڑا ہے اطمینان جو اس طرح افرادِ معاشرہ (بلکہ نوعِ انسانی) کو حاصل ہو گیا کہ ہم پر حکومت صرف اس کتاب کی ہوگی۔ حکم صرف اس کا چلے گا۔ اس سے ہٹ کر کوئی ہم سے کسی قسم کا حکم منوانے کا اختیار و اقتدار نہیں رکھے گا۔ حتیٰ کہ جو ہم سے اس کے قوانین کی اطاعت کرائے گا وہ پہلے خود اس کی اطاعت کرے گا۔ اس اعتبار سے نہ کوئی حاکم ہوگا نہ محکوم۔

ختمِ نبوت بطور منشورِ آزادی

میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ یہ اطمینان (کہ ہم سے کوئی شخص اپنا حکم نہیں منوا سکے گا۔ فرماں پذیری صرف اس

کتاب کی ہوگی)، حضورؐ نبی اکرم کے زمانہ کے انسانوں ہی کو حاصل نہیں تھا۔ یہ اطمینان قیامت تک آنے والی انسانیت کو یکساں طور پر حاصل ہوگا۔ وہ اس طرح کہ اس کتاب کی تکمیل کے بعد اعلان کر دیا کہ نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اب قیامت تک کوئی شخص آکر یہ نہیں کہہ سکے گا کہ تمہارے خدا نے یہ حکم دیا ہے، تم پر اس کی اطاعت لازم ہے۔ خدا نے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ اپنی اس کتاب میں کہہ دیا ہے۔ اس کے بعد خدا نہ کچھ اور کہے گا، نہ اس میں تغیر و تبدل کرے گا۔ یہ ہماری بدقسمتی تھی، عزیزانِ من! (اور میں کہوں گا کہ اسلام کے خلاف بہت بڑی سازش) کہ ختمِ نبوت کو محض ایک اعتقادی مسئلہ بنا دیا گیا۔ ورنہ، یہ تمام نوعِ انسان کیلئے قیامت تک، ایسا منشورِ آزادی تھا جو ہر نوعِ غلامی کے لئے پیغامِ موت تھا۔ سوچئے کہ یہ کتنا بڑا اعظیم اعلان تھا کہ جو انسان، گروہ یا قوم انسانوں کی محکومی سے نجات حاصل کرنا چاہے، وہ اس کتاب کو دیکھ لے سمجھ لے۔ اس کی آزادی پر صرف وہی پابندیاں عائد کی جا سکیں گی جن کا تعین اس کتاب میں کر دیا گیا ہے۔ اب کوئی شخص آکر یہ نہیں کہہ سکے گا کہ، میں تو ایک طرف، خدا نے بھی تم پر یہ مزید پابندیاں عائد کر دی ہیں، یا ان پابندیوں میں کوئی تغیر و تبدل کر دیا ہے۔ یہ تھا عالم گیر، ابدی، منشورِ آزادی جسے ختمِ نبوت نے تمام نوعِ انسان کو عطا کیا تھا۔ یعنی یہ ضمانت کہ اب کسی شخص یا گروہ کو کسی ایسی بات کے منوانے یا کوئی ایسی پابندی عائد کرنے کا حق اور اختیار حاصل نہیں ہوگا جو اس کتاب میں نہیں، خواہ وہ مملکت کے نام پر ہو یا خود خدا کے نام پر۔ اس سے بڑی آزادی کا تصور بھی کیا جا سکتا تھا، یا کیا جا سکتا ہے؟

ان پابندیوں کا مقصد

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کتاب اللہ میں جو حدود مقرر یا جو پابندیاں عائد کی گئی ہیں ان سے مقصد کیا ہے؟ انسانوں کی طرف سے جو پابندیاں دوسرے انسانوں پر عائد کی جاتی ہیں، اس سے مقصد ان لوگوں کے اختیارات کو کم یا محدود کرنا ہوتا ہے جن پر وہ پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ یعنی ان کی آزادی کو محدود یا سلب کرنا۔ لیکن قرآن یہ کہتا ہے کہ جو پابندیاں خدا کی طرف سے عائد کی جاتی ہیں ان سے یہ مقصد نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ (۲/۲۸۶) خدا کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسانی ذات میں مزید وسعتیں پیدا ہوں۔ پابندی سے انسانی ذات کی مضمر صلاحیتوں میں وسعت پیدا ہونا، ایک ایسا نفسیاتی طریقِ عمل ہے جس کی پردہ کشائی (اور وہ بھی صرف ایک حد تک) عصرِ حاضر میں علم النفس (PSYCHOLOGY) کی رو سے ہو سکی ہے۔ اس سے پہلے یہ بات بہت کم سمجھ میں آئی تھی۔ ماہرینِ علم النفس بتاتے ہیں کہ انسانی ذات کی جو توانائی کسی تخریبی مقصد کے لئے بروئے کار آ رہی ہو، اس کے راستے میں روک کھڑی کر دی جائے، اس کا رخ بدل دیا جائے تو وہ دگنی شدت سے تعمیری مقاصد میں مصروف ہو جاتی ہے۔ اس طریقِ عمل کو ان کی اصطلاح میں (SUBLIMATION) کہا جاتا ہے۔ قرآن نے آج سے چودہ سو سال پہلے اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیا تھا کہ انسانی ذات پر جو پابندیاں عائد کی گئی ہیں، ان سے مقصد یہ ہے کہ عملِ تبدیلِ رخ (SUBLIMATION) سے انسانی ذات کی وسعتوں میں اضافہ کر دیا جائے۔ لَا یُکَلِّفُ

اللّٰہ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ (۲/۲۸۶) عام سطح پر اسے یوں سمجھئے کہ نہر کے پانی کی روانی میں سستی واقع ہو جائے تو وہاں پتھروں کی ٹھوکر (FALL) بنا دی جاتی ہے۔ اس سے مقصد نہر کی روانی میں رکاوٹ پیدا کرنا نہیں ہوتا۔ جب نہر اس ٹھوکر سے ٹکراتی ہے تو اس کی روانی میں کہیں زیادہ تیزی آجاتی ہے۔ یہ ہے مقصد کتاب اللہ کی رو سے عائد کردہ پابندیوں کا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ رسول اللہ سے کہا گیا تھا کہ آپؐ کتاب اللہ کے مطابق نظامِ حکومت قائم کریں۔ اس کا ایک مقصد تو یہ بتایا گیا کہ: وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (۷/۱۵۷) اس سے نوعِ انسانی کے سر پر سے وہ بھاری بھرکم سلیں اُتر جائیں گی جن کے نیچے وہ دبی چلی آ رہی تھی۔ اس سے انسانیت غلامی کی ان زنجیروں سے آزاد ہو جائے گی جن میں وہ جکڑی ہوئی تھی۔ یہ مقصد بجائے خویش بڑا عظیم ہے لیکن پھر بھی یہ منفیانہ مقصد ہے۔ قرآن ان سلوں کے نیچے دبی ہوئی اور ان زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو ان سے رہائی دلا کر، مثبت قدم اٹھاتا ہے، اور رسولؐ اللہ کا دوسرا مقصد یہ بتاتا ہے کہ وَيُزَكِّيْهِمْ (۲/۱۲۹) وہ افرادِ انسانیہ کی ذات کی نشوونما کا انتظام کرتا ہے۔ یہ فریضہ رسولؐ اللہ کی ذات تک محدود نہیں تھا بلکہ اس نظام کا مقصد تھا جسے کتاب اللہ کی عملی تنفیذ کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ اس جماعت کے متعلق جو اس نظام کے قیام کی ذمہ دار تھی، کہا گیا کہ: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ (۲۲/۴۱) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ملک کا اقتدار ان کے ہاتھ میں آئے گا تو یہ نظامِ صلوٰۃ قائم کریں گے اور "زکوٰۃ دیں گے"۔ وقت نہیں کہ میں اسلامی نظامِ حکومت کے اس پروگرام کی تشریح و تفصیل سامنے لاسکوں جسے اس مختصر سی آیت میں اس جامعیت سے بیان کر دیا گیا ہے۔ اس وقت میں اس کے صرف اس گوشے کی وضاحت کروں گا جس کا تعلق موضوعِ زیرِ نظر سے ہے۔ یعنی فرد کی انفرادیت کی وسعت۔ اس کی ذات کی نشوونما۔ ہمارے ہاں "زکوٰۃ" سے عام مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ اپنے مال میں سے، سال کے بعد کچھ رقم خدا کی راہ میں دے دی جائے لیکن اس اصطلاح کا قرآنی مفہوم اس سے کہیں وسیع ہے۔ یہاں کہا یہ گیا ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت کا فریضہ "ایتائے زکوٰۃ" ہے۔ زکوٰۃ لینا یا وصول کرنا نہیں۔ زکوٰۃ دینا۔ زکوٰۃ کے لفظی معنی ہیں بڑھنا۔ پھولنا۔ پھلنا یا نشوونما۔ "ایتائے زکوٰۃ" سے مراد یہ ہے کہ اسلامی نظام کا فریضہ یہ ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کو سامانِ نشوونما مہیا کرے۔ "نشوونما" میں انسان کی طبیعی نشوونما بھی داخل ہے اور اس کی ذات کی نشوونما بھی۔ جہاں تک طبیعی یا جسمانی نشوونما کا تعلق ہے، اس کے متعلق میں نے، قرآن کے معاشی نظام کے سلسلہ میں، گذشتہ پچیس سال میں بہت کچھ کہا اور بہت کچھ لکھا ہے۔ اس وقت میں اس کے ماحصل کو حضورؐ نبی اکرم کے اس ارشادِ گرامی میں پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں جس میں آپؐ نے فرمایا کہ:۔

جس بستی میں کسی شخص نے اس طرح رات بسر کی کہ وہ بھوکا سویا، اس بستی سے خدا کی حفاظت کی ذمہ داری ختم ہو گئی۔

اور جس کی ذمہ داری کو حضرت عمرؓ نے اپنے ان مشہور الفاظ میں دہرایا کہ:۔

اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت

میں میری جان ہے، کہ روزِ حشر سے اس کی بھی باز پُرس ہوگی۔

یہ ہے اسلامی نظام کے فریضۂ "ایتائے زکوٰۃ" کا وہ گوشہ جس کا تعلق افراد کی طبیعی ضروریات پورا کرنے سے ہے۔ جہاں تک ان کی ذات کی صلاحیتوں کی نشوونما کا تعلق ہے، اس نظام کا منتہیٰ اور مقصود یہی یہ ہے۔ اس کی پہلی شق یہ ہے کہ وہ نظام ایسا ماحول اور ایسی فضا پیدا کرے جس میں لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (۲/۳۸) کی کیفیت ہو۔ یعنی جس میں افرادِ معاشرہ کو نہ بیرونی خطرات کا خوف ہو، نہ ہی ان کی داخلی دنیا میں کسی قسم کا حزن و ملال۔ سوچئے عزیزانِ من! کہ اس نظام کا صرف یہ ایک گوشہ، انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے کتنی محکم بنیاد بن جاتا ہے۔ اس کے بعد، اس نظام کا وہ فریضہ ہے جسے حضور نبی اکرمؐ کے حوالہ سے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ، يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ (۶۲/۲) وہ ان کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کرتا ہے جس سے وہ ایک طرف قانون کی غرض و غایت اور مطلوب و مقصود سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اور دوسری طرف ان کے فہم و فراست اور عقل و فکر کو اس قدر جلا بخشتا ہے کہ ان کی نگاہیں رموز و اسرارِ کائنات کی گہرائیوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ پھر "تزکیھم" کے ساتھ "تطھرھم"۔ (۹/۱۰۳) وہ ان کی انسانی صلاحیتوں کو نشوونما ہی نہیں دیتا بلکہ ان نشوونما یافتہ صلاحیتوں کو اقدارِ خداوندی کے مطابق صرف کرنا بھی سکھاتا ہے۔ اس سے انسانی سیرت میں پاکیزگی اور کردار میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ اسے عملِ تطہیر کہا گیا ہے۔

مقصود و منتہیٰ

تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، آسمانی سلسلہ رشد و ہدایت کا نظام۔ بعثتِ حضرات انبیاء کرامؑ۔ ضابطہ قوانینِ خداوندی کا نزول — حدود اور پابندیوں کا تعین۔ خدا کی آخری کتاب کا مکمل، غیر متبدل اور محفوظ ہونا جس کا منطقی نتیجہ ختمِ نبوت ہے، ان سب کا منتہیٰ و مقصود، (i) نوعِ انسان کو ہر نوع کی غلامی سے نجات دلا کر ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما اور ان نشوونما یافتہ صلاحیتوں کا اقدارِ خداوندی کے مطابق صرف و استعمال ہے، جسے سیرت کی پاکیزگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم میں مزید غور و تفحص سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ فرد کی نشوونما اور تطہیر بھی اس سلسلۂ عمل کی آخری کڑی نہیں۔ اس کی اگلی کڑی یہ ہے کہ اس قسم کے افراد پر مشتمل ایک ایسی جماعت، ایک ایسی امت وجود میں آئے۔ جس کا نصب العین نوعِ انسان کی خیر و بہبود ہو۔ اس امت کے متعلق کہا گیا ہے کہ، كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (۳/۱۰۹) تم وہ صاحبِ خیر اُمت ہو جسے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے متشکل کیا گیا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ قرآنِ کریم نے فرد سے کہا ہے کہ، فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي (۸۹/۲۹-۳۰) تم جنت میں جانا چاہتے ہو تو میرے بندوں کے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ اس ایک حکم نے تصوف کے تصورِ رہبانیت کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ جنت، خانقاہوں کی تجرد گاہوں اور درویش خانوں کی خلوتوں میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ اجتماعی زندگی کی جلوتوں سے حاصل ہوتی ہے۔ بالفاظِ دیگر، فرد، جماعت یا امت کا جزو، اور جماعت یا اُمت کا

فریضہ عالم گیر انسانیت کی فلاح و بہبود — انسانیت کی بہبود کے لئے بھی قرآن "مفادِ مملکت" یا "پبلک انٹرسٹ" جیسی مبہم اصطلاحات استعمال نہیں کرتا۔ وہ واضح اور متعین الفاظ میں کہتا ہے کہ: وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ۔ (۱۳/۱۷) یاد رکھو! بقا اور دوام صرف اس عمل کے لئے ہے جو نوعِ انسان کی منفعت کے لئے ہو۔

فرد اور جماعت کا تعلق

فرد اور مملکت کے باہمی تعلق کے سلسلہ میں جو کچھ میں نے اپنی بصیرت کے مطابق قرآن مجید سے سمجھا ہے اُسے پیشِ خدمت کر دیا ہے۔ لیکن ہمارے زمانے میں ایک اور اصطلاح وجود میں آئی ہے اور وہ ہے نظریۂ اجتماعیت (COLLECTIVISM) یہ نظریہ نہ نیا ہے، نہ منفرد۔ یہ درحقیقت ہیگل کے نظریۂ مملکت ہی کا بدلا ہوا نام ہے۔ اس نظریہ کی رو سے کہا جاتا ہے کہ وجود صرف سوسائٹی یا پارٹی (جماعت) کا ہے، فرد کا نہیں۔ نظریۂ اجتماعیت کے اس مفہوم کے پیشِ نظر، جو کچھ نظریۂ مملکت کے بارے میں کہا جا چکا ہے اس سے الگ یا زائد کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، لیکن چونکہ قرآن کریم جماعتی زندگی پر بڑا زور دیتا ہے، اور نظریۂ اجتماعیت کے مدعی، اسے اپنے نظریہ کی تائید میں پیش کرکے، اسے عین مطابقِ اسلام قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں نے ضروری سمجھا ہے کہ مختصر الفاظ میں اس الجھاؤ کو بھی دور کر دیا جائے۔

ان میں سے بعض کو یہ کہتے بھی سنا گیا ہے کہ اقبالؒ کا نظریہ بھی یہی تھا۔ یہ ستم ظریفی اور اقبالؒ پر انتہائی ظلم ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اقبالؒ فلسفۂ خودی کا علمبردار ہے اور خودی، انفرادیت ہی کا دوسرا نام ہے۔ اقبالؒ کے سارے پیغام کا ماحصل، فرد کی انفرادیت کی نشوونما اور حفظ و بقا ہے۔ وہ انسانی ذات کو اس قدر اہمیت دیتا ہے کہ مملکت یا جماعت تو ایک طرف، وہ اسے ذاتِ خداوندی میں بھی جذب و فنا ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ اس کا منفرد وجود وہاں بھی باقی رکھنا چاہتا ہے۔ اس کی تعلیم و تلقین یہ ہے کہ:

بخود محکم گذار اندر حضورش
مشو ناپید اندر بحر نورش

وہ اس باب میں اس قدر "خود نگر و خود گر و خود گیر" ہے کہ اپنی انفرادیت کا ختم کرنا تو ایک طرف، اگر اس میں ذرا سی بھی کمی آجائے تو وہ اس قیمت پر حیاتِ جاوداں خریدنے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:

اگر یک ذرہ کم گردد ز انگبینِ وجودِ من
باین قیمت نمی ارزم حیاتِ جاودانی را

لیکن (جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں) وہ کہتا ہے کہ فرد کی انفرادیت (یا خودی) تصوف کی خلوت گاہوں میں مستحکم نہیں ہوتی، جماعت کے ساتھ رہتے ہوئے نشوونما پاتی اور استحکام پذیر ہوتی ہے۔ وہ رموزِ بے خودی میں کہتے ہیں:

فرد را ربطِ جماعت رحمت است — جوہرِ او را کمال از ملت است
تا توانی با جماعت یار باش — رونقِ ہنگامۂ احرار باش

یعنی فرد، جماعت کے ساتھ صرف ربط رکھتا ہے۔ اس میں جذب اور فنا نہیں ہو جاتا۔ وہ اس حقیقت کو تشبیہاتی انداز میں یوں بیان کرتے ہیں کہ :-

فرد و قوم آئینہ یک دیگر اند — سلک و گوہر کہکشان و اختر اند
فرد می گیرد ز ملت احترام — ملت از افراد می یابد نظام

ملت، افراد سے الگ کوئی شے نہیں۔ وہ انہی کے ربطِ باہمی سے وجود پذیر ہوتی ہے :-

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

اور :-

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر — ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

جب افراد کا نصب العین واحد ہو جائے، جب ان میں یک نگہی اور ہم آہنگی پیدا ہو جائے تو انہیں ملت کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس حقیقت کو وہ جاوید نامہ میں ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :-

چیست ملت؟ ایکہ گوئی لا الٰہ! — با ہزاراں چشم بودن یک نگہ

میں نے کلامِ اقبالؒ سے یہ چند اشعار مثالاً پیش کر دیئے ہیں، ورنہ ان کا سارا کلام، کسی نہ کسی نوعیت سے، ان کے فلسفۂ خودی (انفرادیت) ہی کی تفسیر ہے۔ بعض مقامات پر البتہ وہ غلط تشبیہ استعمال کر گئے ہیں، جس سے عصرِ حاضر کے نظریۂ اجتماعیت کی تائید ہو جاتی ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں :-

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

"موج اور دریا" کی تشبیہ مغالطہ آفریں ہے — ارسطو کی تشبیہ، اعضا اور جسم سے بھی زیادہ مغالطہ آفریں۔ اس تشبیہ کی رو سے، فرد کا واقعی کوئی وجود باقی نہیں رہتا۔ وجود، جماعت ہی کا ثابت ہوتا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہے، یہ تشبیہ کی غلطی ہے، اور شاعری میں ایسا ہو جاتا ہے۔ اقبالؒ کی پیش کردہ صحیح تشبیہ اس شعر میں ملتی ہے جو میرے نزدیک بڑا حقیقت کشا اور بصیرت افروز ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ :-

زندگی انجمن آراء و نگہدارِ خود است
ایکہ در قافلہ! با ہمہ رو بے ہمہ شو

افرادِ کارواں، اور کارواں (قافلہ) کی تشبیہ برجستہ ہے۔ قافلہ، افرادِ قافلہ سے الگ اپنا وجود نہیں رکھتا۔ وہ افرادِ قافلہ ہی کے ربطِ باہمی سے وجود پذیر ہوتا ہے۔ البتہ افرادِ قافلہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ قافلہ کے ساتھ رہیں تاکہ وہ سفر کے خطرات سے محفوظ و مصئون، منزل تک پہنچ جائیں۔ قرآنِ کریم، فرد اور جماعت میں یہی تعلق قائم کرتا ہے جب کہتا ہے کہ :-

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۳/۱۹۹)

اے افرادِ جماعتِ مومنین! تم خود بھی استقامت پذیر رہو اور دوسروں کی استقامت پذیری کا بھی

موجب بنو، اور باہنوں میں باہنیں ڈالے، قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے، جانبِ منزل رواں دواں رہو۔ یہی کامیابی کا طریق ہے۔

یہ ہے فرد اور جماعت کا باہمی تعلق۔ یعنی افراد کا ربطِ باہمی جو ان کی تقویت کا موجب بنتا ہے اور اسی کو جماعت کہا جاتا ہے۔ اس میں نہ تصوف کی فنائے ذات ہے، جس میں "عشرتِ قطرہ، دریا میں فنا ہو جانا" ہوتا ہے اور نہ ہی عصرِ حاضر کا نظامِ مملکت یا نظریۂ اجتماعیت، جس میں مقصود بالذات مملکت یا اجتماعیت کا وجود ہوتا ہے اور افراد محض ان کے وجود کو قائم رکھنے کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ قرآن کا پیامِ حیات بخش، ان تمام نظریات کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ اس نے فرد کی انفرادیت کو دو لفظوں میں اس قدر جامعیت سے سمو کر رکھ دیا ہے کہ نگہِ بصیرت اس سے وجد میں آجاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جماعتی زندگی بجا اور درست۔ لیکن:۔

وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادٰى۔ (۶/۹۵)

تم ہمارے حضور فرد کی حیثیت ہی سے آؤ گے۔ اور فرد کی حیثیت ہی سے تم سے تمہارے افکار و کردار کے متعلق باز پرس ہوگی۔ یہی خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کا نقطۂ ماسکہ ہے۔ افراد، دین کے متعین کردہ مقصد کو منظم حیثیت سے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی اس تنظیمی ہیئت کا نام جماعت یا امت ہے۔ یہ مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ: كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا۔ (۹/۴۰) تاکہ دنیا میں، انسانوں کا وضع کردہ نظام نہیں، خدا کا متعین کردہ نظام غالب رہے۔ اقوامِ عالم نے مختلف نظامہائے حیات کو آزما کر دیکھ لیا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی ان کے لئے وجہِ تسکین نہیں بن سکا۔ اب وہ ہار تھک کر، ایک ایسے نظام کی تلاش میں سرگرداں ہیں جو انہیں "مصرعِ موزوں" کی شکل میں تو کہیں نظر نہیں آتا لیکن ان کے فکر کے ضمیر میں پہلو بدل رہا ہے۔ (ERICH FROMM) کو اس کی جھلک کچھ اس طرح دکھائی دیتی ہے۔

وہ نظام یا معاشرہ جس میں کوئی فرد کسی دوسرے فرد کے مقاصد کے حصول کا آلۂ کار نہیں۔ وہ (فرد) بلا استثناء اور بلا مشروط، خود اپنا مقصود آپ ہے۔ اس معاشرہ میں کسی فرد کو کسی ایسے مقصد کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا، نہ ہی وہ خود اپنے آپ کو کسی ایسے مقصد کے لئے استعمال کرتا ہے، جو اس کی انسانی صلاحیتوں کے مشہود کرنے کے لئے نہ ہو۔ وہ معاشرہ جس میں مرکزی حیثیت فرد کو حاصل ہو اور اس کی تمام اقتصادی اور سیاسی سرگرمیوں کا محور ذاتی نشوونما ہو، اس معاشرہ میں طمع، ہوس، استحصال جیسے جذبات کا مقصد نہ تو مادی مفاد میں اضافہ کا موجب ہو اور نہ کسی کے ایغو کی تسکین کا باعث۔ جس میں ہر فرد اپنی آزاد ضمیر کے مطابق کام کرے اور اس کے ایسا کرنے کو اس کا بنیادی جوہر تسلیم کیا جائے۔ جس میں مواقع پرستی اور اصول شکنی کو خلافِ تقاضائے معاشرت تصور کیا جائے جس میں فرد، معاشرتی امور میں اس طرح دلچسپی لے کہ وہ اس کے ذاتی معاملات بن جائیں جس میں دوسرے انسانوں کے ساتھ اس کے تعلقات ایسے ہی ہوں جیسے اپنے گھر کے افراد کے ساتھ ہوتے ہیں۔ جس میں ایک فرد ایسا آزاد ہو کہ وہ علیٰ قدرِ وسعت و امکان سرگرمِ عمل رہے اور معاشرہ کی زندگی میں ایک ذمہ دار معاون قرار پائے ——— معاشرہ کی زندگی

بھی اور خود اپنی زندگی میں بھی۔ وہ جو نوعِ انسان کی وحدت اور استحکام میں ——— اضافہ کا موجب ہو اور افراد معاشرہ کو نہ صرف اس کی اجازت دے بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کرے کہ وہ باہمد گر محبت اور اخوت سے رہیں۔ یہ معاشرہ، ہر فرد کی تخلیقی سرگرمیوں میں اس کا ممد و معاون ہو۔ عقل و بصیرت کے دروازے اس پر کھولے اور ہر فرد کو اس قابل بنا دے کہ وہ اپنے داخلی جذبات کا اجتماعی آرٹ اور رسوم کی شکل میں اظہار کر سکے۔

(P. 241-42)

یہ مفکر، اس قسم کے معاشرہ کو (THE SANE SOCIETY) کہہ کر پکارتا ہے اور یہی اس کی اس کتاب کا نام ہے جس سے یہ اقتباس دیا گیا ہے۔ قرآن کریم اس معاشرہ کی خصوصیات کو بڑی شرح و بسط سے بیان کرتا ہے۔ لیکن وہ اس کے ماحصل، منتہیٰ و مقصود کو، دو لفظوں میں سمیٹ دیتا ہے، جب کہتا ہے کہ: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ۔ (۱۷/۷۰) ہم نے انسان کو واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ اور اس کی اس تکریم کا تحفظ معاشرہ کا منتہائے مقصود ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

برتر از گردوں مقامِ آدم است   اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

یہ ہے اس باب میں، حرفِ آخر اور قولِ فیصل۔ جس معاشرہ یا نظام میں، فرد کے شرف اور احترام پر ذرا سی بھی زد پڑتی ہو، وہ انتہائی مردود و ملعون ہے، اور مقصدِ تخلیقِ کائنات کے حصول کی راہ میں روڑے اٹکانے کا موجب ہے

ہزار گونہ فرائع و ہزار گونہ فروغ
یہ ایک بات کہ آدم ہے صاحبِ مقصود

خدا، اس کے ملائکہ اور عالم گیر انسانیت کی لعنت ہے اُس نظام، اُس مملکت، اُس معاشرہ پر، جس میں فرد اپنی انفرادیت سے محروم، اور آدم شرفِ آدمیت سے محروم ہو جائے۔ اور ہر شخص سہمے سہمے زندگی بسر کرے۔

عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (۲/۱۶۱)

قرآنی نظام میں احترامِ آدمیت کی اہمیت کس حد تک تھی اس کا اندازہ اس ایک چھوٹے سے واقعہ سے لگائیے کہ (عہدِ فاروقی میں) ایک دفعہ حمص کے حاکم، حضرت عمیر بن سعدؓ کے منہ سے کسی ذمّی (غیر مسلم رعایا کے فرد) کے متعلق یہ الفاظ نکل گئے ——— اخزل اللّٰہ۔ "خدا تجھے رسوا کرے۔" ——— اس پر انہیں اس قدر ندامت اور تاسف ہوا کہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر استعفٰے دے دیا اور کہا کہ میں اس منصب کا اہل نہیں۔

بابُ المراسلات

۱۔ قرآنِ کریم کے مطابق فیصلے

ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ جہاں تک شخصی قوانین کا تعلق ہے، عدالت میں یہ بتانا ہوتا ہے کہ وہ کس فقہ کے مطابق فیصلہ چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جو لوگ کسی فقہ کے مطابق نہیں بلکہ قرآن مجید کے مطابق فیصلے کرانا چاہیں، وہ ایسے موقع پر کیا کریں! مثلاً میں اپنے ترکہ کے متعلق وصیت کرنا چاہتا ہوں۔ قرآنِ مجید کی رو سے میں اپنے پورے ترکہ کے لئے جس کے حق میں جی چاہے وصیت کر سکتا ہوں، چاہے وہ میرے وارثوں میں سے ہو یا نہ۔ ایسا کرنا قرآنِ شریف کی رو سے مجھ پر فرض قرار دیا گیا ہے۔ لیکن ہمارے مروجہ قانونِ شریعت کی رو سے، وصیت صرف ایک تہائی ترکہ میں ہو سکتی ہے۔ اور وہ بھی اپنے ورثا میں سے کسی کے حق میں نہیں۔ ایسی صورت میں عدالت میں کیا کہا جائے؟

طلوعِ اسلام

ہم اس سے پہلے متعدد بار لکھ چکے ہیں کہ مروجہ قانونِ وصیت، قرآنِ مجید کی نصِ صریح کے قطعاً خلاف ہے، لیکن چونکہ عدالتیں مروجہ قانون کے مطابق فیصلے کرنے کی پابند ہیں، اس لئے وہ اپنے آپ کو مجبور پاتی ہیں۔ چونکہ آئین پاکستان میں یہ شق موجود ہے کہ یہاں کوئی قانون کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہوگا اس لئے قانونِ وصیت کو (TEST CASE) کی طرح، عدالت میں چیلنج کیا جا سکتا ہے۔ اس کیلئے عملاً کیا صورت اختیار کی جا سکتی ہے، اسے ماہرینِ قانون ہی بتا سکتے ہیں۔ اگر کوئی صاحب اس قانون کو عدالت میں چیلنج کرنا چاہیں تو طلوعِ اسلام ان سے تعاون کرے گا۔ اس سلسلہ میں قرآنِ مجید کے متعلقہ حوالے، پرویز صاحب کی اس کتاب سے مل سکتے ہیں جو "قرآنی قوانین" کے نام سے حال ہی میں ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

۲۔ معراج شریف کب ہوا تھا؟

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ معراج شریف ۲۶ رجب کو منایا جاتا ہے۔ لیکن یہاں کچھ لوگ کہتے ہیں کہ

معراج شریف درحقیقت رمضان المبارک میں ہوا تھا۔ کیا آپ بتائیں گے کہ اصل حقیقت کیا ہے؟

طلوعِ اسلام یہ ہمارا موضوعِ تحقیق نہیں۔ لیکن کچھ عرصہ ہوا، مولانا احمد علیؒ کا ایک مضمون روزنامہ کوہستان کے معراج النبیؐ نمبر (۱۹ اکتوبر ۱۹۶۸ء) کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے اس کے متعلق جن اختلافات کا ذکر کیا تھا، اسے ہم نے طلوعِ اسلام بابت دسمبر ۱۹۶۸ء میں شائع کیا تھا۔ ہم انہیں درج ذیل کرتے ہیں:-

اختلاف روایات معراج شریف کس سال میں ہوا		اختلاف روایات معراج شریف کس ماہ اور کس سال میں ہوا	
سال	حوالہ کتاب	نام ماہ	حوالہ کتاب
ہجرت کے چھ ماہ پہلے ہوا	فتح الباری شرح بخاری باب معراج	شوال	فتح الباری وعینی شرح البخاری
ہجرت کے آٹھ ماہ پہلے ہوا	〃 〃 〃	ذوالحجہ	〃 〃 〃
ہجرت کے گیارہ ماہ پہلے ہوا	〃 〃 〃	ربیع الاول	〃 〃 〃
ہجرت سے ایک سال پہلے ہوا	فتح الباری وعینی شرح البخاری	ربیع الآخر	فتح الباری
ہجرت سے چودہ ماہ پہلے ہوا	فتح الباری	رجب	فتح الباری وعینی شرح البخاری
ہجرت سے پندرہ ماہ پہلے ہوا	فتح الباری وعینی شرح البخاری		
ہجرت سے سترہ ماہ پہلے ہوا	〃 〃 〃	رمضان	فتح الباری
ہجرت سے اٹھارہ ماہ پہلے ہوا	〃 〃 〃	〃	〃
ہجرت سے تین سال پہلے ہوا	عینی شرح بخاری	〃	〃
ہجرت سے آٹھ سال پہلے ہوا	〃 〃 〃	〃	〃

یہ اختلاف

(۱) اس واقعہ کے ضمن میں ہیں جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب حضورؐ نے اسے بیان فرمایا تو کفار نے اس پر بڑے اعتراض کئے اور اس طرح اس کا چرچا عام ہو گیا۔ اور

(۲) اختلافات، مختلف کتب روایات و سیر سے نہیں لئے گئے، احادیث کی معتبر ترین کتاب ـــ بخاری کی شروح ـــ سے لئے گئے ہیں۔

اس ایک مثال سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ ہماری (کتب تاریخ میں نہیں بلکہ) کتب احادیث تک میں، خود عہد رسالتمآبؐ کے اہم ترین واقعات کے متعلق بھی جو کچھ مذکور ہے اس میں کس قدر تضاد ہے۔

حقائق و عبر

۱۔ یہ، اسلامی قوانین مرتب کریں گے؟

فرقہ اہلِ حدیث کے ترجمان، الاسلام (لاہور) نے اپنی اشاعت بابت (۱۴) اپریل ۱۹۷۸ء میں، حکومت سے کچھ مطالبات پیش کئے ہیں۔ ان مطالبات کو "ماہنامہ" رضائے مصطفےٰ" (گوجرانوالہ) نے اپنی اشاعت بابت مئی ۱۹۷۸ء میں دُہرا کر، ان کی سخت مخالفت کی ہے۔ "رضائے مصطفےٰ" کے نام سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ جریدہ، بریلوی فرقہ کا ترجمان ہے جس کے مشہور نمائندہ (مولانا) نورانی ہیں۔ یہ وہ حضرات ہیں (یعنی فرقہ اہلِ حدیث اور بریلوی فرقہ کے نمائندگان) جو (منجملہ دیگر علماء) مملکتِ پاکستان کے لئے ایک متفق علیہ اسلامی قوانین کا ضابطہ مرتب کرنے کے ذمہ دار تصور کئے جاتے ہیں۔ آپ ان مطالبات اور ان کی مخالفت پر ایک نگاہ ڈالئے اور پھر سوچئے کہ ان حضرات سے اسلامی قوانین مرتب کرنے کی توقعات وابستہ کرنے سے، قوم اپنے آپ کو کتنے بڑے فریب میں مبتلا رکھ رہی ہے۔ مطالبات حسبِ ذیل ہیں:۔

۱۔ بے نماز کافر ہیں، انہیں کوڑوں اور جرمانہ کی سزا دی جاوے۔
۲۔ قبر پرستی، بت پرستی سے بڑا شرک ہے۔ ایسے لوگوں کو سزا ملنی چاہیئے۔
۳۔ قبروں پر نذر نیاز، چڑھاوے حرام ہیں۔ انہیں قانوناً بند کر دیا جائے۔
۴۔ عرسوں کو سنگین جرم قرار دیا جائے۔ عرس قتل اور زنا سے ..... سخت تر گناہ ہے۔
۵۔ پختہ قبریں گرا دی جائیں اور ایسے لوگوں کو قید کی سزا دی جائے۔
۶۔ میلاد، گیارھویں شریف اور صلوٰۃ قبل اذان کو خلافِ قانون قرار دیکر کوڑوں کی سزا دی جائے۔
۷۔ تقلید پر عمل پیرا مقلدین آئمہ کو سزائے موت دی جائے۔

(بہ حوالہ، فرقہ اہلِ قرآن کا ترجمان، بلاغ القرآن۔ بابت جولائی ۱۹۷۸ء)

۲۔ بات چل نکلی ہے .....

جیسا کہ معلوم ہے، طلوعِ اسلام اپنے روزِ اوّل سے یہ کہتا چلا آ رہا ہے کہ اگر اسلامی قوانین کی بنیاد اس مطالبہ پر ہے کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق ہوں، تو اس کے لئے قدم اوّل یہ ہے کہ سنتِ رسول اللہ

کا ایسا مجموعہ مرتب کیا جائے جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ طلوعِ اسلام کی یہ آواز منفرد تھی، اور اس کی مخالفت میں مذہبی پیشوائیت متحد، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ایسا مجموعہ مرتب نہیں ہو سکتا — بلند الحمد کہ طلوعِ اسلام کی اس آواز نے فضا کو متاثر کر دیا ہے اور اب اور گوشوں سے بھی اس کی صدائے بازگشت سنائی دینے لگ گئی ہے۔ اسی ضمن میں، کراچی کے اردو روزنامہ امن ۱۴ر جون ۱۹۷۸ء میں شائع ہونے والا شذرہ ملاحظہ فرمایئے جو درج ذیل ہے۔

پاکستان بننے کے دن سے آج تک ہر حاکم وقت یہ کہتا رہا ہے اور ہمارے آئین میں بھی یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ قرآن و سنت پر عمل کیا جائے گا۔

قرآن کی بات تو صاف ہے اس لئے کہ غلطیوں سے پاک قرآن مجید موجود ہے، اور اس میں لکھی ہوئی باتوں کو پڑھ کر ان پر عمل کرنے کے طریقے مرتب کئے جا سکتے ہیں لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوتی، سنت پر عمل کو بھی لازم ٹھہرایا گیا ہے اور سنتِ نبویؐ پر کوئی ایک کتاب ایسی نہیں ہے جو جامع ہو اور جس پر مسلمانوں کے تمام فرقوں میں کوئی اختلاف نہ ہو۔

قرآن کو سمجھنے کے لئے اور قرآن سے رہنمائی کے لئے سنتِ نبویؐ کو سمجھنا بہت ضروری ہے اور یہی وہ نکتہ ہے جہاں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان اختلاف رائے ہے۔ یہ بات نہیں کہ احادیث موجود نہ ہوں لیکن صرف ان احادیث پر سب کا اتفاق ہے جو قرآن مجید کے عین مطابق ہیں۔ جن احادیث کی قرآن سے توثیق نہیں ہوتی ان پر اختلاف شروع ہو جاتا ہے اور مختلف فرقے مختلف احادیث پر مختلف رائے رکھتے ہیں۔

اس کا آسان مطلب یہ ہے کہ جب تک سنتِ نبویؐ پر کوئی ایک ایسی جامع کتاب مرتب نہیں کی جائے گی جس پر تمام علماء کرام میں اتفاق رائے ہو اس وقت تک "قرآن و سنت" کے مطابق قانون نافذ کرنا ممکن نہ ہوگا۔ گویا اسلامی کونسل کو سب سے پہلے سنتِ نبویؐ پر ایک متفقہ کتاب کی تیاری کا کام کرنا چاہیئے اور اس مقصد کے لئے تمام مکاتبِ فکر کے مستند علمارِ کرام کا ایک بورڈ قائم کرنا چاہیئے تاکہ منزل آسان ہو سکے۔

کیا جنرل ضیاء الحق اس سلسلہ میں اسلامی کونسل کو خصوصی ہدایات دینے کے لئے تیار ہیں ————؟

۳۔ یہ کس قسم کے کوڑے ہیں؟

ہمارے ہاں آج کل کوڑوں کی جو سزا دی جاتی ہے اس میں کوڑوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ عام طور پر

کڑیل جوان بھی پانچ سات کوڑوں سے زیادہ کی تاب نہیں لا سکتے اور اکثر و بیشتر بیہوش ہو جاتے ہیں۔ اور ڈاکٹری مشورہ کے مطابق ان کے باقی ماندہ کوڑوں کو منسوخ کر دینا پڑتا ہے۔ اور ان کے زخموں کے مندمل ہونے میں کافی عرصہ لگ جاتا ہے۔ پچھلے ماہ اخبارات میں ایک خبر شائع ہوئی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ سعودی عرب میں (جہاں جرائم کی "اسلامی سزائیں" دی جاتی ہیں) بعض برطانوی باشندوں کو کوڑوں کی سزا دی گئی۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

لندن، ۱۵ر جون (رائٹر) شراب کے قانون کی خلاف ورزی کرنے پر سعودی عرب میں مزید دو برطانوی باشندوں کو سرعام کوڑے لگائے گئے اور سزائے قید دی گئی ہے ان دو برطانوی باشندوں کو سزائے قید اور کوڑوں کی سزا کا انکشاف برطانوی دفتر خارجہ نے کیا ہے۔ اس سے پہلے جن دو باشندوں کو شراب تقسیم کرنے پر سرعام کوڑے لگائے گئے تھے برطانیہ واپس چلے گئے ہیں۔ میڈمنٹ اور کوپر کو ستر ستر کوڑے لگائے گئے تھے اور چھ چھ ماہ سزائے قید دی گئی تھی۔ میڈمنٹ اور کوپر نے ہیلتھرو کے ہوائی اڈے پر بتایا کہ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں تاہم انہوں نے مزید کچھ نہیں بتایا۔ جن دو مزید افراد کو سزائے قید اور کوڑے لگائے گئے ہیں ان میں ۲۰ سالہ پیرسن اور ۵۰ سالہ پیڈی ڈالسن ہیں اور دونوں امریکی فرم لاک ہیڈ ایئر کرافٹ کارپوریشن کے ملازم ہیں۔ پیرسن کو دو سو کوڑے اور دو سال قید اور پیڈی کو ڈیڑھ سو کوڑے اور اٹھارہ ماہ قید کی سزا دی گئی۔ (نوائے وقت ۔ ۱۶ ۶/۲۸)

معلوم نہیں کہ وہاں کوڑے کس قسم کے ہوتے ہیں کہ پچاس پچاس سالہ بوڑھے، ڈیڑھ ڈیڑھ، دو دو سو کوڑے کھا کر بھی ٹھیک ٹھاک رہتے ہیں؛ اگر کوئی صاحب اس کی متعینہ تفصیل بتا سکیں تو طلوع اسلام ان کا شکر گذار ہوگا۔

۴۔ اسے کیا کہیں گے؟

ایشیائی اسلامی کانفرنس کے انعقاد کے موقع پر (جو کراچی میں شروع جولائی ۱۹۷۸ء میں منعقد ہوئی تھی) مودودی صاحب نے اخبارات میں ایک بیان دیا جس میں (منجملہ دیگر امور) کہا گیا کہ:۔

اس وقت دنیا اشتراکیت اور سرمایہ داری کے دو نظریات اور نظاموں میں بٹی ہوئی ہے جو بظاہر ایک دوسرے سے متصادم ہیں مگر درحقیقت دونوں ایک ہی تہذیب کی پیداوار ہیں۔ اسلام کی نگاہ میں گمراہی کے اعتبار سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور ان میں سے کوئی بھی کسی سے کم یا زیادہ غارت گر نہیں۔

(بحوالہ، نوائے وقت۔ ۷ر جولائی ۱۹۷۸ء)

مودودی صاحب نے (بزعم خویش) اسلام کا جو معاشی نظام پیش کیا ہے اس کی تفصیل آپ کو ان کی

کتاب "مسئلہ ملکیت زمین" میں ملے گی۔ اس میں وہ فرماتے ہیں :-

اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی ہے۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت، جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلا حدود نہایت رکھی جا سکتی ہے۔ روپیہ، پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے۔ پھر آخر تنہا زرعی جائیداد میں وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر صرف اس کے معاملہ میں شریعت کا میلان یہ ہو کہ اس کے حقوقِ ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کر دیا جائے، یا انتفاع کے مواقع سلب کر کے ایک حدِ خاص سے زائد ملکیت کو آدمی کے لئے عملاً بیکار کر دیا جائے۔

(مسئلہ ملکیت زمین - پہلا ایڈیشن - ص ۵۳-۵۲)

ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں :-

آخری چیز جو مسلمان مصلحین کی نگاہ میں رہنی ضروری ہے یہ ہے کہ اسلام کے حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز ملکیتوں پر نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عائد کر سکتے ہیں اور نہ ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں جو شریعت کے دیئے ہوئے جائز حقوق[1] کو عملاً سلب کر لینے والی ہوں۔ اسلام جس چیز کا آدمی کو پابند کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو کچھ مال آئے جائز راستے سے آئے۔ جائز طریقے پر استعمال ہو۔ جائز راستوں میں جائے اور خدا اور بندوں کے جو حقوق اس پر عائد کئے گئے ہیں وہ اس میں سے ادا کر دیئے جائیں۔ اس کے بعد جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو، اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔ پھر جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم صرف اسی تجارت یا صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو جسے تم براہِ راست خود کرو، اور جس طرح اس نے دنیا کے کسی دوسرے معاملہ میں ہم پر یہ قید نہیں لگائی ہے کہ تم کسی ایسے کام پر حقوقِ ملکیت نہیں رکھ سکتے جس کو تم اُجرت یا شرکت کے طریقے پر دوسروں کے ذریعے سے کر رہے ہو، اسی طرح وہ یہ بھی

---

[1] جائز سے مراد ہے اس قانونِ شریعت کی رو سے جائز جو اس نظامِ سرمایہ داری کا وضع کردہ ہے۔ (طلوعِ اسلام)

[2] یہ حقوق صدقہ اور خیرات کی رو سے ادا ہو جاتے ہیں۔ (طلوعِ اسلام)

نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بس وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے اور یہ کہ اُجرت یا شرکت پر کاشت کرانے والوں کو سرے سے زمین پر حقوقِ ملکیت حاصل ہی نہیں ہیں۔ اس قسم کی قانون سازیاں خود مختار لوگ تو کر سکتے ہیں مگر جو خدا اور رسول کے مطیع فرمان ہیں وہ ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتے۔ (ایضاً۔ ص ۷۳-۷۲)

جہاں تک نیشنلائزیشن (قومی ملکیت) کا تعلق ہے، وہ کہتے ہیں:-

ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا تخیل بنیادی طور پر اسلام کے نقطۂ نظر کی ضد ہے۔ لہٰذا اگر ہمیں اسلامی اصول پر زمین کے بندوبست کی اصلاح کرنی ہو تو ایسی تمام تجویزوں کو پہلے قدم ہی پر لپیٹ کر رکھ دینا چاہیئے جن کی بنیاد میں قومی ملکیت کا نظریہ، اصول یا نصب العین کی حیثیت سے موجود ہو۔ بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اسلام زبردستی مالکانِ زمین کی ملکیتیں چھین لینے کی اجازت نہیں دیتا اور بات صرف اتنی بھی نہیں ہے کہ وہ ایسے قوانین بنانے کی اجازت نہیں دیتا جن کے ذریعہ سے کسی شخص یا گروہ کو اپنی ملکیت حکومت کے ہاتھ بیچنے پر مجبور کیا جا سکے بلکہ درحقیقت اسلامی نظریۂ تمدن و اجتماع سرے سے اس تخیل ہی کا مخالف ہے کہ زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار حکومت کی ملکیت ہوں اور پوری سوسائٹی اس مختصر سے حکمران گروہ کی غلام بن کر رہ جائے جو ان ذرائع پر متصرف ہو۔ جن ہاتھوں میں فوج اور پولیس اور عدالت اور قانون سازی کی طاقتیں ہیں انہی کے ہاتھوں میں اگر سوداگری اور کارخانہ داری اور زمینداری بھی سمٹ کر جمع ہو جائے تو اس سے ایک ایسا نظامِ زندگی پیدا ہوتا ہے جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا ہے۔ اس لئے یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ اگر غاصبانہ طریقہ سے زمینوں پر قبضہ نہ کیا جائے بلکہ پورے پورے معاوضے دے کر حکومت تمام زمینوں کو ان کے مالکوں سے برضا و رغبت خرید لے تو اسلامی نقطۂ نظر سے اس میں کوئی قباحت نہیں۔ جزئیاتِ شرع کے لحاظ سے چاہے اس میں قباحت نہ ہو مگر کلیاتِ شرع کے لحاظ سے یہ تخیل ہی غلط ہے کہ عدلِ اجتماعی کی خاطر زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار کو انفرادی ملکیتوں سے نکال کر قومی ملکیت بنا دیا جائے۔ یہ انصاف کا اشتراکی تصور ہے نہ کہ اسلامی تصور۔ اور اس تصور کی بنیاد پر ایک اشتراکی معاشرہ پیدا ہوتا ہے نہ کہ اسلامی معاشرہ۔ اسلامی معاشرہ کے لئے تو یہ نہایت ضروری ہے کہ اس سے اگر سب نہیں تو اکثر افراد اپنی معیشت میں آزاد ہوں اور اس غرض کے لئے ناگزیر ہے کہ ذرائع پیداوار افراد ہی کے ہاتھوں میں رہیں۔ (ایضاً۔ ص ۷۱-۷۰)

کیا کوئی ماہر اقتصادیات بتائیں گے کہ اس قسم کے معاشی نظام کو کیا کہا جائے گا؟ اگر یہ نظامِ سرمایہ داری نہیں تو پھر نظامِ سرمایہ داری کیا ہوتا ہے؟

ضمناً۔ جس اخبار میں مودودی صاحب کا مندرجہ بالا بیان شائع ہوا ہے، قومی ملکیت کے متعلق اسی

میں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر محترم جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کے یہ ارشادات بھی شائع ہوئے ہیں:۔

اسلام میں انفرادی ملکیت کو مکمل تحفظ دیا گیا ہے اور اسلامی نظام کے نفاذ کے بعد کوئی بھی حکومت صنعتوں کو قومی تحویل میں نہیں لے سکے گی۔ ایوانِ صنعت و تجارت (کراچی) میں اراکین کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اسلامی نظام کے نفاذ کے بعد کوئی حکومت بافرد کسی صنعت کو بالجبر قومی ملکیت میں لیتا ہے تو اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جا سکے گی۔ ویسے اگر حکومت عدالتیں اسلامی اصولوں کے مطابق کام کرنے لگیں تو کسی فرد کی املاک کو قومی ملکیت میں لینے کا جواز باقی نہ رہے گا۔ اگر بالفرض مجبوراً حکومت کوئی اقدام کرتی ہے تو اس کا مکمل معاوضہ ادا کرے گی۔ انہوں نے اپنی بات پر زور دے کر مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ کاروباری طبقے کی جانب سے اس سلسلہ میں آئینی تحفظ کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ وہ یہ بات نظر انداز کر رہے ہیں کہ کوئی حکومت آئین میں حسبِ منشا ترمیم بھی کر سکتی ہے، مگر اسلامی نظام کا نفاذ اس کی مؤثر ضمانت ہے۔ (نوائے وقت - ۷ جولائی ۱۹۷۸ء)

۵۔ اے کاش!

مودودی صاحب نے اپنے اس بیان میں جس کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے، یہ بھی فرمایا کہ:۔

اسلام کے علمبرداروں کو اسلام کا سچا نمونہ ہونا چاہیئے..... اسلام کی تبلیغ صرف زبان، قلم اور کانفرنس سے نہیں ہو سکتی۔ (نوائے وقت - ۷ جولائی ۱۹۷۸ء)

اے کاش! مودودی صاحب اس زریں اصول کا اطلاق خود اپنی ذات پر بھی کرتے!!

۶۔ ذرا ہنس لیجئے!

کراچی کے روزنامہ جنگ کی ۱۲ جون کی اشاعت میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی ہے:۔

تحریکِ استقلال کے سربراہ ایئر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خاں نے امیر جماعتِ اسلامی میاں طفیل محمد کے اس بیان کے بارے میں کہ سویلین حکومت میں شامل ہونیوالی پارٹی کو انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت نہ دی جائے، سکھوں کی سی بات قرار دیا ہے..... انہوں نے کہا کہ اس بیان سے جماعتِ اسلامی کے بارے میں یہ بات آشکارا ہو گئی ہے کہ وہ اقتدار میں آنے کے بعد اپنے مخالفین سے کیا سلوک کریگی اور اپنے مخالفین پر پابندی لگا دے گی۔

میاں طفیل محمد صاحب نے تو جو کچھ کہا سو کہا۔ حیرت ہے کہ ایئر مارشل صاحب کو بھی اب جا کر معلوم ہوا کہ جماعتِ اسلامی اقتدار میں آنے کے بعد اپنے مخالفین سے کیا سلوک کریگی؟ انہوں نے تو یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رکھی کہ اگر وہ برسرِ اقتدار آ گئے تو ان مسلمانوں کو جو ان کے ہمنوا نہیں ہونگے ایک سال کا نوٹس دینے کے بعد قتل کر دیا جائیگا۔ (بحوالہ، مرتد کی سزا۔ از مودودی صاحب)۔

احتساب

(۲)

(تشکیلِ پاکستان کے بعد جتنی حکومتیں وقتاً فوقتاً برسرِ اقتدار آتی رہیں ان کے قابلِ اعتراضات اقدامات پر طلوعِ اسلام کی طرف سے ساتھ کے ساتھ مؤاخذہ ہوتا رہا۔ ان تاریخی حقائق کی یاد دہانی کے طور پر، انہیں اب احتساب کے عنوان سے پیشِ قارئین کیا جا رہا ہے۔ اس کی پہلی قسط طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۷۸ء میں شائع ہو چکی ہے۔ دوسری قسط اب ملاحظہ فرمائیے)۔

مارچ ۱۹۴۹ء کا طلوعِ اسلام ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جبکہ مسلم لیگ کے بعض قدیم متوسلین، مسلم لیگ کی عظمتِ رفتہ کے گن گا گا کر اپنی قیادت کا ڈھونگ رچانا چاہتے تھے۔ ان کے مضحکہ خیز بیانات اور عجیب و غریب مضامین اخبارات میں شائع ہو رہے تھے۔ طلوعِ اسلام، وحدتِ ملت سے قرآنی نقطۂ نظر کے تحت پارٹیوں کو ختم کرنے کا داعی تھا۔ چنانچہ اس نے ان حضرات کی بوالعجبیوں کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے "لمعات" میں لکھا:۔

آپ نے دیکھا کہ لیگ کو کس طرح واجب الاحترام اور "قابلِ پرستش" بنایا جا رہا ہے۔ یہ سب مغربی سیاست کی قدم بقدم تقلید ہے۔ وہ لوگ "قوم" یا "وطن" کو ایک بت بنا دیتے ہیں۔ اور پھر عوام سے اس کی پرستش کراتے ہیں۔ اور اس سے مقصد اپنی پارٹی کا تحفظ اور پائندگی ہوتا ہے۔ اس طرح یہاں لیگ کا بت بنایا جا رہا ہے ..... لیکن یہ لیگ کیا بلا ہے جس کا تحفظ اور استحکام ہر مسلمان کا ضروری فرض قرار دیا جا رہا ہے۔ یہ لیگ اس پارٹی کا نام ہے جو زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہے۔ اس پارٹی (یعنی چند افراد) کا تحفظ اور استحکام، ملت کا فریضہ بتایا جاتا ہے۔ تحفظ اور استحکام، ملت کا ضروری ہے، نہ کہ ملت کی کسی پارٹی کا۔ یاد رکھیئے قرآن نے جب فرقہ بندی کو شرک قرار دیا تھا تو اس سے مقصود مذہبی فرقے ہی نہیں تھے، سیاسی پارٹیاں بھی تھیں۔ اسلام کے نزدیک پوری کی پوری ملت ایک جماعت ہے۔ ملت کے اندر پارٹیوں کا تصور یکسر غیر اسلامی تصور ہے۔ یہ خالص مغربی سیاست کا تتبع ہے (اور وہ بھی بہت بھونڈی شکل میں) اور ہوسِ اقتدار کی تسکین کا سامان۔ لیگ کی تجدید سے پاکستان میں پارٹی بازی کی لعنت کا جو بیج بو دیا گیا ہے اس کا نتیجہ

وہ نخوت اور انتشار ہوگا جو ملک کو جہنم بنا دے گا۔ ..... غور کیجئے کس طرح چند افراد کی ہوسِ اقتدار پوری کی پوری قوم کو جہنم کے گڑھے کی طرف لے جاتی ہے۔

(طلوعِ اسلام بابت مارچ ۱۹۴۹ء۔ صـ)

یہ آزادی!

حصولِ پاکستان کے بعد اخلاقی اقدار کے بندھن کس تیزی سے ٹوٹ رہے تھے اور معاشرہ کیسی اندوہناک آوارگی کا شکار ہوا جا رہا تھا اس کا تجزیہ کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے "مجبوریاں" کے عنوان سے لکھا:۔

جب ہمیں نئی نئی آزادی ملی تو ہمارے "اعلیٰ سوسائٹی" کی "بیگمات" ایک دوسری کی دیکھا دیکھی، اچھلتی، پھاندتی، ایک دو نہیں، دس بیس قدم آگے بڑھ گئیں۔ مرد خوش تھے کہ "بیگمات" مہذب بن رہی ہیں۔ اب جو ذرا طوفان تھما ہے تو بیٹھے سوچ رہے ہیں کہ یہ کیا ہو گیا؟ نہ کہیں حیا ہے نہ غیرت، نہ شرم ہے نہ جوہرِ نسائیت۔ گھروں کی جنتیں جہنم میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ اولاد آوارہ ہو رہی ہے۔ سکون و اطمینان مفقود ہو چکا ہے۔ اقتصادی حالت تباہ کن درجہ تک پہنچ چکی ہے۔ وہ صورتِ آئینہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں اور چپ ہیں ..... (شمارہ جون ۱۹۴۹ء۔ صـ)

لیکن اس نے اپنا فریضہ اسی تنقید تک محدود نہیں رکھا اس نے واضح کیا کہ اس طوفانِ بدتمیزی کو اس طرح بے لگام چھوڑا نہیں جا سکتا ورنہ اخلاقی اقدار تہس نہس ہو کر رہ جائیں گی۔ اس کا علاج تجویز کرتے ہوئے اس نے لکھا:۔

اس کا علاج بھی چنداں مشکل نہیں۔ نمائشِ حسن کے جذبہ کی تسکین، دیکھنے والوں کی نگاہوں سے ہوتی ہے۔ آپ اپنی نگاہوں کو روک لیجئے نمائش خود بخود ختم ہو جائے گی۔ کسی ایسے اجتماع میں شریک نہ ہوجئے جہاں عورتوں کی ان بے باکیوں کا مظاہرہ ہو رہا ہو۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ دیکھیں گے کہ یہ جذبۂ نمائش کس طرح ٹھٹھر کر رہ جاتا ہے .....

اپنی نگاہ کو روکئے حسنِ عریاں، جوہرِ ستور بننے پر مجبور ہو جائے گا۔

صوبائی تعصبات

پاکستان کے داخلی استحکام کو اگر کوئی سب سے ہولناک خطرہ لاحق ہو سکتا ہے تو وہ صوبائی تعصبات کا ہے۔ یہی منافرت ہے جو ملت کے اجتماعی شعور کو زیر و زبر کر کے رکھ دیتی ہے۔ اور دینی اخوت کا وہ تصور جس سے اُمت بنیانٌ مرصوص کی حیثیت اختیار کرتی ہے، ملیامیٹ ہو جاتا ہے۔ عظمتِ ملی کا یہی وہ بنیادی تقاضا تھا جسے پیشِ نظر رکھتے ہوئے قائدِ اعظمؒ نے اپنی ہر تقریر اور ہر بیان میں اس تعصب کی پُرزور مذمت کی۔ لیکن ان کی وفات کے بعد، حکومتِ پاکستان نے خود یہ فیصلہ کر دیا کہ مرکزی ملازمتوں میں مشرقی اور مغربی پاکستان کی نیابت الگ الگ ہو گی۔ اور پھر اس کے بعد مغربی پاکستان کے مختلف صوبوں میں بھی یہی ضابطہ اختیار کر لیا گیا۔ طلوعِ اسلام نے اس فیصلہ کے خطرناک نتائج کا جائزہ لیا اور اس کی

مذمت کرتے ہوئے لکھا:-

آپ نے غور فرمایا کہ صوبائی تقسیم کا وہ شجرِ ملعونہ جسے انگریز کی حکمتِ فرعونی کا ابلیسی کارنامہ کہا جاتا تھا کس طرح خود اپنے ہاتھوں، اپنے صحنِ چمن میں پیوست کر دیا گیا۔ اور اس کی آبیاری کیسے ذمہ دار ہاتھوں سے ہوئی۔ یہ تو تھی مشرقی اور مغربی پاکستان کی تقسیم۔ اب آگے بڑھیئے۔ حال ہی میں حکومت کے شائع کردہ ایک منشور میں کہا گیا ہے کہ مغربی پاکستان کے حصہ کی اسامیاں پنجاب، سرحد، سندھ، کراچی، بلوچستان، قبائلی علاقہ میں الگ الگ تقسیم کی جائیں گی۔ لیجئے! یہ ہے وہ تقسیم جو انگریز کے ملعون عہد میں بھی کبھی نہ ہوئی تھی ..... ایک طرف زبان سے یہ کہا جاتا ہے کہ صوبائی امتیاز ایک خبیث لعنت اور مستقبل میں تشویش انگیز نتائج کا پیش خیمہ ہے اور دوسری طرف اس تعصب کی جڑیں ایسی مضبوط کی جا رہی ہیں جو کسی کے اکھیڑے نہ اکھڑ سکیں۔ معاشرتی زندگی میں صوبائی تعصب، طنز و تشنیع سے آگے نہیں بڑھا کرتا۔ لیکن جب آپ صوبائی حدود کے ساتھ مستقل مفاد وابستہ کر دیں تو یہ وہ ہڈی ہوتی ہے جس پر انسان کتوں کی طرح لڑتے ہیں۔

(لمعات۔ شمارہ ستمبر ۱۹۴۹ء۔ صـ۳)

دیہات کی بیچارگی

پاکستان کی اسّی (۸۰) فیصدی آبادی دیہات میں پھیلی ہوئی ہے اور یہ کروڑوں انسان تعلیم، علاج اور دیگر ضروریاتِ زندگی کے لئے جس طرح ترس ترس کر دن گزارتے ہیں اس کا اندازہ لگانا انسان نہیں۔ سیلاب کے طوفانوں میں دیہاتی عوام کو جس تباہی کا شکار ہونا پڑا اور پھر اس سے جو بیماریاں پھیلیں، ان کے باعث ان وسیع آبادیوں میں ویرانوں کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ طلوعِ اسلام کی نگہ دور رس نے ان المناک مناظر کا جائزہ لیا۔ دیہاتی عوام کی آہوں اور کراہوں کو دل کے کانوں سے سنا اور پھر اس کے بعد اپنے "لمعات" میں ان کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا:-

قوم پر یہ کچھ ... رہی ہے اور قوم کی حفاظت و بہبود کے اجارہ دار، یا تو نئی الاٹ شدہ ملوں، فیکٹریوں اور جائیدادوں کے الٹ پھیر میں مصروفِ تگ و تاز ہیں، یا پھر وزارتوں اور ممبریوں کی دھن میں الیکشن بازیوں اور پارٹی سازیوں کے "جہادِ عظیم" میں مشغول۔ ان کم بختوں کو، زیادہ نہیں تو قوم کی حفاظت کا اتنا ہی فکر ہونا چاہیئے جتنا قصاب کو اپنی بکریوں کا خیال رہتا ہے۔ انہیں اتنی سوجھ بھی تو نہیں کہ اگر قوم اس طرح سسک سسک کر ختم ہو گئی تو پھر یہ کس کے خون پر موٹے ہوں گے؟ یہ تو فرعون سے بھی گئے گزرے ہو گئے کہ اسے بنی اسرائیل کی پرورش کا تو خیال رہتا تھا۔ انہیں اپنے سیاسی دھندوں اور رہ باز یوں سے اتنی بھی فرصت نہیں ملتی کہ خود اپنے مستقبل کے مفاد کی بابت ہی کچھ سوچ سکیں اب ہم کس سے جا کر کہیں کہ ہے

از باغبان شداست کہ صیاد آں نکرد

ارباب نظم و نسق کی بے حسی کا یہ عالم ہے۔ رہنمایانِ ملت کی شقاوتِ قلبی کی یہ کیفیت۔ اس کس مپرسی اور بے چارگی کی حالت میں، بے کس و بے بس انسانوں کا یہ ہجوم، رہ رہ کر آسمان کی طرف دیکھتا اور ایک آہِ سرد بھر کر بصد حسرت و یاس انتہائی خاموشی سے پوچھتا ہے۔

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

(لمعات۔ شمارہ نومبر ۱۹۴۹ء۔ صفحہ ۷۷-۷۸)

قائد آباد کے مہاجرین

دارالسلطنت کراچی میں قائدِ اعظمؒ کے مزار سے ملحق ہزاروں مہاجرین کس طرح اپنے "قائد آباد" کی شکستہ حال جھونپڑیوں میں زندگی کے دن گزار رہے تھے۔ کس طرح ان سوختہ سامانوں کی جھونپڑیاں آئے دن بارشوں کے سیلاب میں بہتی نظر آتی تھیں اور کس طرح غلاظت کے ڈھیروں پر رینگتی پھرتی تھیں۔ حکومت کی نگہ کرم کبھی ان کی طرف مائل نہ ہو سکی۔ لیکن جب اسی آبادی سے ملحق انٹرنیشنل اسلامک کانفرنس اور اقتصادی نمائش کا انتظام کرنا پڑا تو اس تباہ حال بستی کے دامن میں دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں روپے کے صرفِ عظیم سے، کس طرح ایک ویرانہ خوبصورت سٹالوں سے آراستہ ہو کر جشنِ چراغاں کا منظر پیش کرنے لگا۔ اب وہاں بجلی بھی پہنچ گئی اور پانی کے نل بھی لگ گئے۔ پارک بھی بن گئے اور عیش و تفریح کے سامان بھی ترتیب پا گئے۔ طلوعِ اسلام نے انسانیت کے اہم تقاضوں کی بجا آوری میں سرد و متضاد نقوش کو دیکھا۔ سب سے پہلے قائد آباد کی سوختہ سامانی کا نقشہ کھینچا۔ پھر کانفرنس اور نمائش کی دلفریبیوں کی تصویر پیش کی اور اس کے بعد لکھا:۔

> قائدِ اعظمؒ کے مزار کے ایک طرف اس طرح دولت و ثروت کی نمائش ہو رہی ہے اور دوسری طرف نکبت و فلاکت اور تباہی و بربادی کی نمائش۔ وہ نمائش چند دن کی عارضی ہوگی اور یہ نمائش اسی طرح بدستور چلی جائے گی۔ اس نئی نمائش میں اس قوم کی معاشی حالت سدھارنے کی تجاویز پر غور و فکر ہوگا جو دولت و ثروت کی اس نمائش کے عین سامنے سکراتِ موت میں ایڑیاں رگڑ رہی ہے، مرنے والا اسی قسم کی نمائشوں کے داعیان کے متعلق کہہ گیا تھا کہ:۔
>
> من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
> بہرِ تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند!

(طلوعِ اسلام۔ دسمبر ۱۹۴۹ء۔ صفحہ ۲)

قومی نمائندگی کے اجارہ دار

صوبائی اور مرکزی کارفرماؤں کی مفاد پرستیوں نے ملک میں غربت و افلاس اور بے بسی و بے چارگی کے خرابے پھیلا رکھے تھے کہ انہی دنوں مغربی پنجاب میں صوبائی انتخابات کی ہنگامہ آرائیوں کا آغاز ہوا۔ کیمبلپور

کے ایک خادمِ قوم نے اس مرحلہ پر ایک پمفلٹ شائع کیا اور اس میں اعداد و شمار کے باوثوق ذرائع سے بہ تفصیل پیش کی کہ یہ بڑے بڑے جاگیردار، جو قوم کی نمائندگی کے اجارہ دار بن کر میدان میں آرہے ہیں، کس طرح سابقہ انتخابات میں مسلم لیگ کے قومی فنڈ سے لاکھوں روپے اپنی انتخابی مہم پر بے دریغ صرف کر چکے ہیں۔ طلوع اسلام نے قومی زندگی کے اس فیصلہ کن مرحلے پر ان اعداد و شمار کو اپنے کالموں میں شائع کیا اور عوام کو حقیقتِ حال سے خبردار کرتے ہوئے اس ضمن میں لکھا:-

> قرآن، ان انسان نما درندوں کو، جن کے منہ کو آدمی کا نمکین خون لگ گیا ہو" مترفین" کی جامع اصطلاح سے پکارتا ہے۔ ان میں ہر وہ ملعون گروہ شامل ہوتا ہے جو دوسروں کی کمائی پر عیش کرتا ہے۔ پیرہن ان کے مختلف ہوتے ہیں لیکن روح ہر جگہ ایک ہی ہوتی ہے — فرعونیت (بادشاہت) یا اس کے جانشین، دورِ حاضرہ کی جمہوری قباؤں میں چھپے ہوئے مستبدین۔ ہامانیت، یا اسلامی لیبل لگانے والی ملائیت اور پیریت، قارونیت یا عصرِ رواں کے جاگیردار، خوانین، کارخانہ دار، زمیندار وغیرہ، یہ سب مترفین ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ یہی وہ گروہ ہے جو انتخابی موسم پر راہنمایانِ قوم کے نگاہ فریب پردوں میں آتا ہے۔ اور عوام کے جذبات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر، ان کے نمائندوں کی حیثیت سے، اقتدار کی کرسیوں پر متمکن ہو جاتا ہے۔ اور جب تک یہ تمکن قائم رہتا ہے، یہ انہی لوگوں کا خون چوسنے میں مصروف رہتا ہے جن کا نمائندہ بن کر گیا تھا۔ اس مختصر سے پمفلٹ میں اسی گروہ کی نقاب کشائی کی گئی ہے اور مخصوص واقعات اور اعداد و شمار سے بتایا گیا ہے کہ یہ غارت گرانِ متاعِ ملت کس بری طرح اس غریب قوم کو لوٹ کھسوٹ رہے ہیں۔ (طلوع اسلام - دسمبر ۱۹۶۲ء - ص ۳۸)

پاکستان کا نیا کلچر

جشنِ نوروز (یکم جنوری) کی تقریب پر، جس کا تعلق صرف عیسائیوں سے ہے، کراچی کی ایک کلب میں رات کو جو رنگ رلیاں منائی گئیں اور عریانی و فحاشی کے جو شرمناک مناظر بپا ہوئے اس کی داستان قرآنی نظام کے اس نقیب کو خاموش نہ رکھ سکی۔ "پاکستان کا نیا کلچر" کے عنوان سے اس نے سب سے پہلے اس کلب کی حیاسوز فضا کا نقشہ پیش کرتے ہوئے لکھا:-

> فرنگی کا سانپ یہاں سے ڈھائی برس ہوئے نکل گیا، لیکن وہ فرنگیت کی لکیریں یہاں کس گہرائی سے چھوڑ گیا ہے، اس کا اندازہ شراب و شباب کی اس محفلِ خمار آگیں سے لگائیے جو سالِ نو کی آمد کی خوشی میں، کراچی کے ایک بہت بڑے کلب میں، ۳۱ دسمبر اور یکم جنوری کی درمیانی شب کو انتہائی مستیوں اور رنگینیوں میں ڈوب کر منائی گئی۔ ایک دیدہ ور تماشائی کے بیان کے مطابق عمالِ حکومتِ پاکستان کی اکثر بیگماتِ شفق سامان اور دخترانِ برق داماں، مغربی نیم عریاں لباس میں ساق و سینہ کی ہوش ربا جلوہ پاشیوں کے ساتھ

اس محفلِ رنگ و تعطر میں غارت گرِ ہوش و تمکین بن رہی تھیں۔ ان کا کہنا ہے کہ عشائیہ (SUPPER) کے بعد میں نے پینے کے لئے پانی مانگا تو میرے نے ایک معنی خیز تبسم کے ساتھ میری طرف دیکھا جو کھلے الفاظ میں کہہ رہا تھا کہ یہ اگلے وقتوں کی بوسیدہ روح یہاں کیا کرنے آ گئی۔ اس نے کہا حضور! یہاں

شاہد و شمع و شراب و شکر و نائو سرود

کے ہجوم میں پانی کا کیا کام؟ آج یہاں پانی کے نلوں سے شراب بہ رہی ہے۔ اس کے بعد محفلِ رقص شروع ہوئی ..... ٹھیک بارہ بجے تمام بتیاں بجھا دی گئیں۔ اس اندھیرے میں کیا کچھ ہوا۔ آنکھوں نے تو دیکھا نہیں۔ البتہ کان اس کی غمازی ضرور کر سکتے ہیں۔ انگریز کے آئینِ معاشی کے مطابق اس اندھیرے میں ہر عورت کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ جسے چاہے چوم لے .....

اور اس کے بعد طلوعِ اسلام نے جو کچھ لکھا اس میں وہ عبرت انگیز اور گہری طنز مضمر تھی جو ہر غیور اور مخلص پاکستانی کا دل خون کر دے۔ سنیئے!

ہمارے راوی کا بیان ہے کہ ایک گوشے سے ایک ساغر شکن "چوماٹ" کے ساتھ کسی مرد کی گھبرائی ہوئی سی آواز آئی کہ ——— ارے یہ کیا؟ ———

اس کے جواب میں، قہقہہ کی بلوریں کھنک سے فضا مرتعش ہوئی اور ایک شوخ و شنگ آواز نے کہا کہ:-

یہ پاکستان کا نیا کلچر ہے

(طلوعِ اسلام۔ جنوری ۱۹۵۰ء۔ ص ۳)

سوچئے کہ یہ الفاظ کس قدر ہوش ربا طمانچہ تھے ان کروڑوں انسانوں کی غیرتِ ملی کے لئے جنہوں نے ایک ارفع و اعلیٰ معاشرتی انقلاب کے لئے اس خطۂ زمین کے حصول میں ہر متاعِ عزیز کی بازی لگائی تھی۔

یادِ اقبالؒ

تصورِ پاکستان کے داعیٔ اوّل، علامہ اقبالؒ کو مرکزی حکومت کی طرف سے جس بے نیازی (بلکہ احسان فراموشی) سے سرکاری تعطیلات و تقریبات میں نظر انداز کیا جا رہا تھا اس پر، دوسری بار پھر، طلوعِ اسلام کو حکومت کی بے حسی اور بے نیازی کا ماتم کرنا پڑا۔ "۲۱ اپریل" کے عنوان سے اس نے لکھا:-

۲۱ اپریل یعنی علامہ اقبالؒ کا یومِ وفات آ رہا ہے۔ اس مردِ درویش کا یومِ وفات جس نے مسلمانوں کو پاکستان کا تصور دیا۔ وہ تصور جس کے متشکل ہونے پر آج سات کروڑ مسلمان انسانی درندوں سے محفوظ و مصئون زندگی گذار رہے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہ دن تیسری بار آ رہا ہے۔ حکومتِ پاکستان نے روزِ اوّل سے ہی اس دن کو

نظر انداز و فراموش کر دیا........ پہلے سال تو خیر حکومت نے با سلیقگی سے آخری وقت پر چھٹی کا اعلان کر دیا۔ لیکن گزشتہ سال اور امسال "نظریۂ پاکستان کے لئے مرحوم کے بے مثال عطایا کی یاد" (یہ الفاظ ایک سرکاری اعلان کے ہیں) کو حافظوں سے محو کر دیا اور ان عطایا کو اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ یوم اقبالؒ مستقل تعطیل قرار پا جائے۔ حالانکہ حکومت نے جنم اشٹمی، دسہرہ، دلہنڈی، شاہ انگلستان کی سالگرہ وغیرہ ایسے ایام کو عام تعطیلات قرار دے رکھا ہے۔ (مارچ سنہ ۱۹۵۰ء - صنے)

اور اس کے بعد "ڈان" کے اقبالؒ نمبر کے سلسلہ میں گورنر جنرل (خواجہ ناظم الدین) کے پیغام کا تجزیہ کرتے ہوئے اس نے لکھا:-

ہم گورنر جنرل صاحب کی خدمت میں بادب گزارش کرتے ہیں کہ "اس مفکرِ اعظم کی یاد میں[1] حکومت جو قلیل سی نذر پیش کر سکتی تھی وہ اس نے نہیں کی اور اقبالؒ کے پیغام حیات بخش کی یاد کو" اس نے فراموش کر دیا۔ اس احسان فراموشی کا جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ لیکن ہم غالبؔ کی ہمنوائی میں اس سے زیادہ کیا کہیں کہ:-

تم ان کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالبؔ
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں!

(ایضاً)

یہ جذبات فروشی

لیاقت نہرو پیکٹ کے بعد (وزیرِ داخلہ پاکستان کی قیادت میں) صحافیوں کا ایک وفد ہندوستان کے خیر سگالی دورہ پر گیا۔ اس دورے میں وزیرِ داخلہ اور ان کے رفقاء اپنی تقریروں میں خیر سگالی کے جوش میں جذباتی طور پر اس قدر بڑھ گئے کہ یہ سب کچھ غیرتِ ملی کے منافی نظر آنے لگا۔ طلوعِ اسلام نے اس قسم کی افسوسناک جذباتی روش کے نفسیاتی اثرات کو بروقت محسوس کیا اور جون سنہ ۱۹۵۰ء کے افتتاحیہ (لمعات) میں ایسی نفسیات کا دوٹوک تجزیہ کرتے ہوئے لکھا:-

مسلمان صحافیوں کا ایک وفدِ خیر سگالی ہندوستان جاتا ہے اور اس مقصد کی اہمیت کے پیشِ نظر پاکستان کے وزیرِ داخلہ ان کے ہمراہ جاتے ہیں۔ یہ اقدام بڑا مستحسن تھا لیکن جذباتی مسلمان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہاں پہنچ کر یہ اس قسم کی تقریریں شروع کر دیتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا کلچر ایک ہے۔ ان کے نظریاتِ زندگی میں کوئی تفاوت نہیں۔ اور یہاں تک بھی کہ مسلم لیگ کی قسم کی "فرقہ وارانہ" جماعتوں سے انہیں کبھی سروکار نہیں رہا۔ کیونکہ شاید وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں بُعد اور مغائرت کی ذمہ دار ہیں۔

---

[1] یہ گورنر جنرل کے پیغام کے الفاظ تھے۔

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا کہئے!

یہ وہی جذبات فروشیاں ہیں جو اس سے پیشتر نہ صرف یہ کہ ہمیں دوسروں کی نگاہوں میں تملق پیشگی کی خفت کا بکر بنا چکی ہیں بلکہ حقائق سے آنکھیں چرا لینے کی وجہ سے باہمی اتحاد کی کوششوں کو بھی نامراد کر چکی ہیں۔ (شمارہ جون سنہ ۱۹۵۰ء۔ ص۵)

نو وارد مہاجرین کا داخلہ

حصولِ پاکستان کے دو اڑھائی سال بعد بھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ ہندوستان میں جن مسلمانوں کا جینا دوبھر بنایا جا رہا تھا وہ انتہائی مجبوری کے عالم میں، اس سرزمینِ پاکستان کا رُخ کر رہے تھے جس کے حصول کے لئے انہوں نے سالہا سال تک جان لڑائی تھی۔ ان حالات میں پاکستان کے وزیر داخلہ نے اپیل کی کہ وہ ترکِ وطن سے احتراز کریں۔ حکومتِ پاکستان نے یہ بھی اعلان کیا کہ آئندہ مزید مہاجرین کی آمد کو روکنے کے لئے سرحد کو مسدود کر دیا جائے گا۔ مسئلہ بڑا اہم تھا۔ طلوعِ اسلام نے سنجیدگی سے اس کے مختلف گوشوں کا جائزہ لیا اور اسی سلسلے میں وہ ایک تلخ حقیقت بھی منظرِ اشاعت پر لایا۔ اس سلسلے میں اس نے لکھا:۔

مسئلہ زیرِ نظر کی اہم ترین حیثیت انسانی ہے، آئینی نہیں۔ ہمارے اپنے وضع کردہ آئینی قوانین کے تقاضے انسانی تقاضوں پر قربان کئے جا سکتے ہیں۔ یہ فیصلہ ایسا ہے جیسے سیلاب سے بچنے کے لئے اپنے دروازے کے سامنے تو بند باندھ دیا جائے لیکن سرچشمۂ سیلاب کو کھلا چھوڑ دیا جائے۔

اس کے بعد اس نے ان نو وارد مہاجرین کے گراں قدر پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا:۔

یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا پر ثابت کر دیا تھا کہ مسلمانانِ ہندوستان کی غالب اکثریت مطالبۂ پاکستان کی موید ہے۔ تشکیلِ پاکستان میں پورا حصہ لینے کے باوجود یہ لوگ ہندوستان میں رہے اور مسلمان ہونے کی پاداش میں جو قیامت بھی ان پر نازل ہوئی اسے برداشت کیا۔ مگر پاکستان پر بوجھ بننا گوارا نہ کیا۔ ان کے مقابلے میں ان کے لیڈر جو ہندوستان میں، تقسیم کے بعد، بالکل امن و اطمینان سے بیٹھے تھے، نہ ان کے گھر لٹے تھے، نہ جانیں تلف ہوئی تھیں، نہ عصمتیں برباد ہوئی تھیں، غرضیکہ ان کا بال تک بیکا نہ ہوا تھا، انہوں نے جب دیکھا کہ پاکستان میں لوٹ مچ رہی ہے تو وہ دیوانہ وار لپکے اور مسلمانوں کو موت کے منہ میں دھکیل کر پاکستان آ گئے۔ یہاں آ کر انہوں نے ہر چیز کو سمیٹا۔ اس پر قبضہ کیا، اس کو الاٹ کرایا، اسے ہتھیایا۔ چنانچہ اس طرح وہ پاکستان کے اجارہ دار بن بیٹھے۔ قوم کی قربانیوں کا یوں فائدہ اٹھا کر اور پاکستانی مالِ غنیمت کو غصب و ہضم کر کے اب وہ یہاں چوہدری بن بیٹھے ہیں اور جو کوئی ہندوستان سے نکال دیا جاتا ہے اور وہ بیچارہ جان اور آبرو بچانے کے لئے پاکستان کا رخ کرتا ہے تو یہ چوہدری چلا چلا کر اسے کہتے

ہیں کہ واپس چلے جاؤ۔ یہاں جگہ نہیں ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ ان چلاّنے والوں کو آخر ان بدقسمت مہاجرین پر کیا فوقیت حاصل ہے؟ اگر ان بھگوڑوں کو مالِ غنیمت میں سے حصّہ مل سکتا ہے تو ان بیچاروں کو کیوں محروم رکھا جائے؟ موجودہ مہاجرین جن پر پاکستان کے در و بام بند کئے جا رہے ہیں، ان کی ہمت قابلِ داد ہے کہ انہوں نے وحشت اور درندگی کا استقامت سے مقابلہ کیا۔ یہ سخت جان یقیناً اپنے محاذوں پر ڈٹے رہتے مگر ان کی مستضعفین کی سی حالت ان مفرورین ملّت نے بنائی۔ وہ قائدین، جن کے سہارے پر مسلمانانِ ہندوستان نے جنگِ پاکستان لڑی تھی، ایک ایک کر کے پاکستان بھاگ آئے۔ ان کے بھاگ آنے سے جو بھگدڑ مچی اس میں سرفروشانِ ملّت پس گئے۔ چنانچہ آج وہ انتہائی بے چارگی اور شکست خوردگی کے عالم میں سوئے پاکستان آ رہے ہیں۔ بے نوا، بے گھر، بے مقصد، بے امام! اُدھر سے ان کو نکالا جا رہا ہے اور اِدھر سے ان کو دھتکارا جا رہا ہے۔ اگر ان کے قائدین اس نفسا نفسی کی فضا میں انہیں تنہا چھوڑ کر بیش پا افتادہ مفادات کی طمع میں بھاگ نہ آتے تو ان کے سہارے قائم رہتے اور وہ پیش نظر حوادث و نوازل کا مردانہ وار مقابلہ کرتے۔ جب کوئی للکارنے والا نہ رہا تو ان کے حوصلے ٹوٹ گئے اور اوسان خطا ہو گئے۔

تو کیا ان لوگوں کو، جو ان مظلومین کی مظلومیت کا حقیقی سبب ہیں، یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ان کی امداد کرنے کی بجائے ان کو ٹھکرا دیں؟ اگر یہ ممکن اور مناسب ہے کہ ان کو پاکستان میں آنے سے روکا جائے اور زبردستی موت کے منہ میں جھونک کر ہندوستان میں رہنے پر مجبور کیا جائے تو کیوں نہ ان سے پہلے ان قائدین کو واپس بھیجا جائے جو ان کی مصیبتوں کے ذمہ دار بنے؟ ان کے واپس جانے سے ان جانبازوں کے آسرے پھر سے قائم ہو جائیں گے۔ وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کریں گے اور اپنی جنگیں خود لڑیں گے۔

(جون سنہ ۱۹۵۰ء ۔ صفحہ ۱۲-۱۳)

وزیرِ خارجہ کا جواب

۵ اگست سنہ ۱۹۵۰ء کو بی بی سی اور پاکستان ریڈیو کی لہروں سے شہرۂ آفاق مؤرخ پروفیسر ٹوئن بی (TOYNBEE) اور چوہدری ظفر اللہ خاں (وزیرِ خارجہ پاکستان) کا باہمی مذاکرہ نشر کیا گیا۔ اس اہم مذاکرہ کی صورت یہ تھی کہ دنیا کا عظیم مؤرخ سوال کر رہا تھا اور پاکستان کی اسلامی مملکت کے وزیرِ خارجہ اس کا جواب دے رہے تھے۔ مذاکرہ کا آغاز کرتے ہوئے پروفیسر موصوف نے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ اسلام دنیا کی مشکلات ختم کرنے میں اہم پارٹ ادا کر سکتا ہے اور جس خوبی سے اس نے قومیتوں اور نسلوں کے امتیازات کو مٹایا وہ ایک درخشندہ کارنامہ ہے اور پھر انہوں نے چوہدری صاحب سے سوال کیا کہ پاکستان کاشتکاروں اور زمینداروں کے مسئلہ کو کس طرح حل کرنا چاہتا ہے۔ چوہدری صاحب نے

اس اہم سوال کا جو مضحکہ خیز جواب دیا اس کا ماتم کرتے ہوئے طلوع اسلام کو "حقائق" کے زیرِ عنوان لکھنا پڑا کہ:-

سوال بڑا اہم تھا۔ براہِ راست تھا۔ خود سائل کی شخصیت بڑی ممتاز تھی۔ دوسری طرف مجیب اس اسلامی حکومت کا رکن تھا جسے دعویٰ ہے کہ وہ دنیا میں اسلامی تصوراتِ حیات کی تجربہ گاہ ہے۔ ایک دنیا اس سوال کے جواب کے لئے گوش برآواز تھی..... آپ کو معلوم ہے کہ اس کا جواب کیا دیا گیا؟ جواب میں کہا گیا کہ ہاں! ہم نے ہائیڈرو الیکٹرک سکیم بنائی ہے۔ جس سے ہماری انڈسٹریز کو فائدہ پہنچے گا۔ اور انڈسٹری اور زراعت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہم نے خود زراعت کی ترقی کے لئے بھی کچھ تجاویز سوچی ہیں۔

یہ تھا جواب اس سوال کا کہ اسلام، زمینداروں اور کاشتکاروں کے مسائل کا حل کس طرح کرتا ہے۔ کیونکہ یہ مسئلہ آج دنیا کے اہم مسائل میں سے ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ چوہدری صاحب اس سوال کا جواب دینے کے اہل ہی نہیں تھے۔ اس لئے کہ ان کے ہاں اسلام کا تصور ایک مذہب کا ہے، دین کا نہیں۔ اور اگر وہ اس کے اہل ہوتے بھی، تو صحیح جواب نہ دے سکتے۔ اس لئے کہ ابھی پچھلے سال ان کے خلیفہ، حضرت مرزا بشیر الدین صاحب نے ایک کتاب شائع کی ہے جس میں اسلام کو ایک خالص سرمایہ دارانہ مذہب ثابت کیا ہے۔ جس میں زمیندار بڑی بڑی زمینداریوں کے مالک ہو سکتے ہیں۔ جب حضرت صاحب کا ارشاد یہ ہو تو چوہدری صاحب اس کے خلاف کس طرح لب کشائی کر سکتے ہیں۔

(ستمبر ۱۹۵۱ء۔ صـ ۶۳)

اس وضاحت کے بعد اسلام اور پاکستان دونوں کی مظلومی پر خون کے آنسو بہاتے ہوئے طلوعِ اسلام نے لکھا:-

اسلام کی مظلومیت پر غور فرمایئے۔ ایک غیر مسلم، بین الاقوامی شہرت کا مالک، فاضل تاریخ اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ اسلام میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ دورِ حاضر کے مسائل کا حل پیش کر سکے۔ اس کے بعد وہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے وزیرِ خارجہ سے پوچھتا ہے کہ اس خاص مسئلے کا حل اسلام کیا پیش کرتا ہے۔ اور اسے جواب ملتا ہے ——— ہائیڈرو الیکٹرک سکیم!.....

بنا بریں، لندن اور کراچی کے اس سب سے پہلے مذاکرہ کا تجربہ بڑا افسوسناک رہا۔ تمام اقوامِ عالم تک، اسلام کا صحیح پیغام پہنچانے کا یہ بہت عمدہ موقع تھا۔ افسوس کہ یہ موقع نہ صرف رائیگاں گیا بلکہ مفکرینِ عالم کے دلوں پر اسلام کے متعلق ایک غلط نقش قائم کر گیا۔ اگر اس سلسلہ کو جاری رکھنا مقصود ہے تو ہم اربابِ حل و عقد سے گزارش کریں گے کہ وہ ان مذاکرات میں، یا تو اسلام کو خارج از بحث قرار دیں اور اگر اسلام کو بحث

میں لانا ہے تو اس کے لئے ایسے لوگوں کا انتخاب کریں جو اس قسم کے سوالات کا صحیح جواب دینے کے اہل ہوں۔ (ستمبر ۱۹۵۱ء - صفحہ ۴۳)

اسلامی اخوّت اور سیاسی معاہدے

انہی ایام میں پاکستان نے مصر اور شام سے یکے بعد دیگرے دو معاہدات (ثقافتی اور تجارتی) طے کئے۔ اس حد تک معاملہ صحیح اور صاف تھا لیکن اس کے بعد ہوا یہ کہ ان معاہدوں پر خوشیاں منائی گئیں اور سرکاری حلقوں میں بالخصوص اس پر اطمینان و مسرت کا اظہار کیا گیا کہ ان معاہدوں کے باعث اب یہ ملک ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے اور باہمی اتحاد کے امکانات بڑھیں گے وغیرہ وغیرہ۔ طبعاً طلوعِ اسلام کے لئے بھی ایسے معاہدات قابلِ اعتراض نہیں ہوسکتے لیکن مسرتوں کے اس اجوم میں اس کی عقابی نگاہیں تصویر کا ایک دوسرا رُخ بھی دیکھ رہی تھیں اور وہ رخ اس قدر اہم تھا کہ اس کے اثرات قلب و نگاہ کی گہرائیوں سے پیوست ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسی بنیادی حقیقت کو منظرِ عام پر لاتے ہوئے اس نے "لمعات" میں لکھا:-

یہ کن ملکوں کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے؟ مصر، شام، عراق، حجاز، یمن، ایران، ترکی، مراکش، انڈونیشیا اور پاکستان کے متعلق۔ آپ کو معلوم ہے کہ ان ممالک کے رہنے والے کون ہیں؟ ان سب کے باشندے وہ ہیں جن کا خدا ایک ہے۔ رسول ایک ہے۔ ضابطۂ قانون (قرآن) ایک ہے۔ قبلہ ایک ہے۔ نصب العین حیات ایک ہے۔ مقصدِ زندگی ایک ہے۔ اساسِ فکر ایک ہے۔ بنیادِ عمل ایک ہے۔ جو ایک کے نزدیک حرام ہے وہی دوسرے کے نزدیک حرام ہے۔ جو ایک کے ہاں حلال ہے، وہی دوسرے کے ہاں جائز ہے۔

اس سے بھی آگے بڑھیئے۔ یہ تمام وہ لوگ ہیں جنہیں بنیان مرصوص سے تشبیہ دی گئی تھی۔ یعنی سیسہ پلائی دیوار کی مانند............ دو لفظوں میں یوں کہیئے کہ یہ وہ ممالک ہیں جن کے باشندوں کے متعلق خود خدا نے کہہ دیا تھا کہ:-

یہ آپس میں ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔

...... یہ وہ رشتہ تھا جس کا اعلان خود خدا نے فرما دیا۔ اور اس کے ایک ایک حرف پر ان سب کا ایمان ہے........ (دسمبر ۱۹۵۱ء - صفحہ ۷)

اس طرح اسلامی رشتۂ اخوت کے تمام گوشوں کی اہمیت تفصیلاً واضح کرنے کے بعد اس اہم اقتباس کے آخر میں اس نے لکھا:-

دنیا کے مختلف حصوں میں بسنے والے افراد، جو اپنا منہ قبلہ کی طرف کرتے تھے، باہمی اخوت کے لئے کسی سیاسی معاہدہ کے محتاج نہیں تھے۔ لیکن آج اسی قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے والے، باہمی روابط کے لئے ثقافتی، تجارتی اور سیاسی معاہدات کے لئے دوڑ دھوپ

کر رہے ہیں .... ظاہر ہے کہ اس دوڑ دھوپ کے محرکات بھی سیاسی ہیں اور اس اتحاد سے مقصود بھی محض سیاسی مفاد کا تحفظ۔ یعنی جذبۂ محرکہ (یا مقصدِ پیشِ نظر) یہ نہیں کہ دنیا کے مسلمان پھر سے اس نظام کو قائم کریں جو ان کے دین کا تقاضا ہے ......

اس میں شبہ نہیں کہ اتحاد ایک اچھی چیز ہے لیکن جو اتحاد آئیڈیالوجی کی وحدت کی بنا پر نہیں بلکہ محض سیاسی مفاد کے تحفظ کے لئے ہوتا ہے اس کا انجام وہی ہوتا ہے جو گزشتہ جنگ کے بعد انگلستان اور روس کے اتحاد کا ہوا...... آج مسلمان اپنی نمازوں میں تو قبلے کی طرف منہ کرتے ہیں لیکن باہمی اتحاد کے لئے "مسلم اتحاد" کی اسکیمیں سوچ رہے ہیں۔ حالانکہ قبلے کی طرف منہ کرنے سے مراد ہی یہی تھی کہ یہ سب ایک ہی بلاک کی اینٹیں ہیں جس کا مرکز کعبۃ اللہ ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اقبالؒ نے ان الفاظ میں توجہ دلائی تھی کہ:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے

مسلمانوں کے اتحاد کی بنیاد" حرم کی پاسبانی" ہے، سیاسی معاہدات نہیں۔ واضح رہے کہ حرم، کعبہ، سے مراد سعودی حکومت کا دارالسلطنت (مکہ) نہیں بلکہ دین کے نظام کا مرکز ہے جہاں سے قرآنی قوانین نافذ ہوں گے اور جو اُمتِ واحدہ کی حکومتِ واحدہ کا مرکز واحد ہوگا۔ لتکونوا شھداء علی الناس۔ تاکہ یہ مرکز تمام اقوامِ عالم کے اعمال کی نگرانی کرتا رہے۔ (دسمبر ۱۹۵۱ء ۔ صفحہ)

۱۹۵۲ء کا آغاز ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی طلوعِ اسلام کا نئے سال کا پہلا شمارہ (جنوری ۱۹۵۲ء) عَلَمِ منزل کے رستے ہوئے ناسور اپنی پہنائیوں میں لئے منظرِ اشاعت پر آتا ہے۔ اس کے لمعات (مقالاتِ افتتاحیہ) بھٹکے ہوئے راہی کے لئے نشانِ منزل کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کالموں میں اس نے سب سے پہلے ایک بہت بڑی خود فریبی کا پردہ یوں چاک کیا۔

> ہم اپنے افلاسِ تدبر اور فقدانِ اہلیت کو چھپانے اور اس طرح اپنے آپ کو فریب میں مبتلا رکھنے لئے لاکھ کہیں کہ مسلمانوں نے حصولِ آزادی کی خاطر اس قدر قربانیاں دی ہیں، لیکن اس طرح خونِ ناحق کے وہ دھبے کبھی نہیں مٹ سکتے جن سے ہم زمانے کی ریگِ رواں کو شفق آگیں بنا چکے ہیں۔ نہ ہی وہ لٹی ہوئی عصمتیں واپس مل سکتی ہیں جو ناموس و شرافت کی ہر عدالت میں ہماری بے حمیتی کی زندہ شہادتیں ہیں۔ ہم میں سے وہ کبوترانِ حرم[1] جو تقسیمِ ہند کی قیامت سے پہلے ہی اڑ کر بامِ پاکستان پر آ بیٹھے تھے، انہیں کیا علم کہ صحنِ گلستان

---

[1] تو اے کبوترِ بامِ حرم چہ می دانی — طپیدنِ دلِ مرغانِ رشتہ برپا را

سے باہر مرغانِ رشتہ بر پا پر کیا گذری ؟
رستے میں کون لٹ گیا منزل کو کیا خبر کشتی کے ڈوب جانے کی ساحل کو کیا خبر
خاروں سے پوچھئے نہ کسی گل سے پوچھئے
صدمہ چمن کے لٹنے کا بلبل سے پوچھئے

لیکن مسلمانوں نے یہ ساری لرزہ انگیز مصیبتیں اور قیامت خیز صعوبتیں اس لئے برداشت کیں کہ ان کے ذہن میں تھا کہ وہ محکومی اور غلامی کے انسانیت سوز جہنم سے نکل کر، حریت و آزادی کی انسانیت ساز جنت کی طرف جا رہے ہیں۔ کس قدر حسین تھا یہ خیال اور کیسی دلکش تھی یہ تمنا۔ اس بات کو قریب ساڑھے چار برس گزر گئے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان عوام نے، جو سر میں یہ سودا لے کر آئے تھے، اس جنت کو پا لیا۔

(جنوری ۱۹۵۲ء۔ ص۱)

"نازک مزاج شاہاں"

اور اس کے بعد اس لئے "نازک مزاج شاہاں تابِ سخن ندارند" کی المناک تفصیل پیش کرتے ہوئے "اپنی قومی آپ بیتی" کو بالفاظِ ذیل سپردِ قلم کیا۔

مشکل یہ ہے کہ ہمارے اربابِ حل و عقد کچھ ایسے چھوئی موئی واقع ہوئے ہیں کہ۔ پاکستان کی داخلی کمزوریوں کا ذرا سا بھی ذکر چھیڑیئے، ان کا کلیجہ فوراً دھک دھک کرنے لگ جاتا ہے کہ ان پر کوئی آفت آئی! یحسبون کل صیحۃ علیھم۔ کہیں پتہ کھٹکا اور انہوں نے کان کھڑے کر لئے۔ کونسا ملک ہے جس میں کمزوریاں نہیں اور کونسی قوم ہے جو لغزشوں اور کوتاہیوں سے منزّہ ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ خوش نصیب ممالک اور فیروز بخت اقوام اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کو دل کے کانوں سے سنتی ہیں اور پھر ان کی تلافی کی کوشش کرتی ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ سیئات مبدل بہ حسنات ہوتی چلی جاتی ہیں۔ لیکن جن قوموں کے "ستارے گردش میں ہوں" وہ اپنی کمزوریوں کے تذکرے سننا کبھی گوارا نہیں کرتیں۔ اس سے ان کا خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ انکی پیشانی پر جعفر کے نقشے بننا شروع ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ ان کے عیوب و اسقام ان کے سامنے آتے ہیں اور نہ ان کی اصلاح کی کوئی صورت پیدا ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں، بدبختی سے، یہی صورت پیدا ہو چکی ہے۔ اس لئے یہاں ہر سوچنے والا دماغ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل کی کشمکش پنہاں میں مبتلا رہتا ہے جو (بقول غالب) اس کے دلِ پُرحسرت کو طلسمِ پیچ و تاب بنائے رکھتی ہے۔

(ایضاً)

پاکستان سے مقصود کیا ہے ؟

پاکستان کے نازک مزاج اور نئے نویلے حکمران عوام کی زبانوں کو مہر بہ لب رکھنے کے لئے یہ فرماتے رہا کرتے

تھے کہ "پاکستان کا تحفظ" سب سے مقدم ہے۔ طلوعِ اسلام نے اس کا بجا طور پر اعتراف کیا۔ لیکن پاکستان کے تحفظ سے مراد کیا ہے؟ اس نے اس کی وضاحت ضروری سمجھی۔ چنانچہ مندرجہ بالا حقائق کی تفصیل کے بعد، اس نے "تحفظِ پاکستان" کی اہم حقیقت کو تفصیل میں لاتے ہوئے لکھا:۔

پاکستان کے استحکام سے مقصود یہ ہے کہ یہ ہمارے تصوراتِ حیات اور نظریاتِ زندگی کی کہکشاں گیر عمارت کی بنیاد ہے۔ یہ بنیاد ہمارے پاس موجود ہے۔ ہم نے اسے جان دے کے پایا۔ اور مر مر کے بسایا ہے۔ ہم اپنے خون سے اس کی حفاظت کریں گے لیکن اس بنیاد پر کوئی عمارت بھی تو بنے! پاکستان کی ساڑھے چار سالہ زندگی پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ اس پر ایک روڑا بھی کہیں رکھا گیا ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ ملک میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جس کے ہاں دولت سیلاب کی طرح امنڈے چلی آ رہی ہے۔ حتیٰ کہ اب ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس دولت کو کیا کریں؟ لیکن قوم اس طبقے کا نام تو نہیں —— قوم تو ان سے آگے کہیں اور بستی ہے! بستی کیا ہے کو ہے، زندگی کے سانس گن رہی ہے۔ لیکن اس طبقے کے محلات اس قدر بلند ہیں کہ وہاں سے نیچے فٹ پاتھ پر ایڑیاں رگڑنے والی قوم دکھائی تک بھی نہیں دیتی۔ دولت کی فراوانی سے کوئی عیب ایسا نہیں جو ان کی سوسائٹی میں حسن نہ بن چکا ہو۔ کوئی برائی ایسی نہیں جس کا لائسنس عام نہ ہو چکا ہو ؎

گذر گیا اب وہ دورِ ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہاں میخانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

(ایضاً صلا)

اربابِ حکومت و شریعت کا گٹھ جوڑ

یہ کچھ بیان کرتے ہوئے اس نے تصویر کے ایک اور گوشے سے نقاب اٹھا۔ یہ گوشہ تھا "اربابِ سیاست" اور "اربابِ شریعت" کی ملی بھگت کا عجیب و غریب نقشہ! —— نقاب کشائی کا یہ فریضہ ادا کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے لکھا:۔

اربابِ شریعت سے اس طبقے کا ساجھا ہے اور اس کی وجہ سے یہ حضرات بھی اس ٹھاٹھ کی زندگی بسر کر رہے ہیں جو تشکیلِ پاکستان سے پہلے ان کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ انہیں اب وہ سب کچھ (کوٹھیاں، ٹیلی فون، فیکٹریاں) میسر ہے جنہیں اس سے پہلے یہ للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا کرتے تھے اور اپنی ہوسِ ناکام کی تسکین کے لئے، ان چیزوں کو "دنیا کے کتول" کا حصہ بتایا کرتے تھے۔ ان میں سے جس کے حصے میں کچھ کمی ہو جاتی ہے وہ اربابِ ثروت و اقتدار کی پارٹیوں کی شراب اور ان کی بیویوں کی بے پردگی کو چوراہے میں اچھالتا ہے اور جب اس کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے تو پھر برسرِ منبر گنگنانا شروع کر دیتا ہے کہ ؎

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں!
ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں

اسلامی کارنامے؟

اور اس کے بعد ان ارباب شریعت کی بارگاہ سے ارباب اقتدار کے حق میں کیا کیا قصیدہ آرائیاں ہوتی ہیں وہ بھی طلوع اسلام کے الفاظ میں سن لیجئے۔

جس طرح اس سے پہلے، اسکولوں کے بچے "عہد انگلشیہ کی برکات" دہرایا کرتے تھے، یہ حضرات، دنیا کی اس سب سے بڑی اسلامی مملکت کی "اسلامی خدمات" کی فہرست گنانا شروع کر دیتے ہیں۔ مثلاً قرارداد مقاصد پاس کر دینے سے یہ مملکت مسلمان ہوگئی ہے۔ رمضان شریف میں شراب کی دکانیں بند کرا دی جاتی ہیں اور ہوٹلوں کے دروازوں پر پردے لٹکا دیئے جاتے ہیں۔ تراویح کی نماز کے لئے پڑھنے اور مصلے بہم پہنچا دیئے جاتے جاتے ہیں۔ ٹریم کا وقت بارہ بجے رات تک بڑھا دیا جاتا ہے۔ رمضان میں دفاتر کے اوقات میں تبدیلی کر دی جاتی ہے۔ جمعہ کے مبارک دن کو دفاتر بارہ بجے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ محرم میں ریڈیو پر گانے کے ساتھ ساز نہیں بجائے جاتے۔ کسی بڑے آدمی کی وفات پر ریڈیو سے مسلسل قرآن خوانی ہوتی رہتی ہے۔ ریڈیو کی نئی عمارت میں قرآن کریم کی آیت (قولوا للناس حسنا) نہایت جلی حروف میں لکھی گئی ہے۔ کراچی ایڈمنسٹریشن نے فطرانے اور کھالیں جمع کرنے کا کام اپنے ذمے لے لیا ہے۔ ریلوے اسٹیشنوں پر قبلے کا رُخ دکھانے کے لئے تیر کے نشانات لگا دیئے گئے ہیں ..... ٹرمپین کو قرآن شریف بطور تحفہ دیا گیا ہے۔

اب اور چاہتے کیا ہو ———— ہمیں ہیری مل جائے؟

قوم یہ وعظ سنتی ہے اور "یا اللہ تیرا شکر" کہہ کر پھر فٹ پاتھ پر ایڑیاں رگڑنے لگ جاتی ہے۔ (ایضاً۔ صلا)

کیا حصولِ پاکستان سے مقصد یہی تھا

سوال پیدا ہوتا تھا (اور بڑا اہم تھا یہ سوال) کہ کیا ان (مذکورۃ تم کارناموں) سے حصولِ پاکستان کا مقصد تکمیل پا گیا۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے، طلوعِ اسلام نے سب سے پہلے ہماری دکھتی رگ کو چھیڑا اور پوچھا۔

کیا یہی ہے وہ عمارت جس کے لئے پاکستان کو بطورِ اساس و بنیاد حاصل کیا گیا تھا؟ کیا یہی تھا وہ مقصد جس کے لئے مسلمان نے اسے جان دے کے پایا اور مر مر کے بسایا تھا؟ کیا یہ بعینہٖ وہی کچھ نہیں جو مسلمانوں کے دیگر ممالک، مثل افغانستان، ایران، عراق، نجد، حجاز وغیرہ میں ہو رہا ہے؟ اگر یہ وہی کچھ ہے تو کیا یہاں بھی اس کے وہی نتائج نہیں

نکلیں گے جو ان ممالک میں برآمد ہو چکے ہیں اور جن کی وجہ سے وہ دنیا کی قوموں کی کسی قطار اور شمار میں ہی نہیں۔ وہاں بھی یہی کیفیت ہے کہ ایک طبقہ سب کچھ سنبھالے اور سمیٹے ہوئے ہے اور باقی قوم کیچڑ کے مکوڑوں کی طرح رینگتی ہوئی زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔ یہ سب اسلامی ممالک کی شان ہے۔ (ایضاً۔ ص ۱۲-۱۳)

نشانِ راہ کیا ہے؟

ایک مخلص اور علم گسار جراح کی طرح تلخ نوائیوں کے یہ نشتر بروئے کار لانے کے بعد طلوع اسلام نے زخموں کے اندمال اور قومی نشاۃِ ثانیہ کی نشاندہی کی (یہ حل قرآن کریم کی بارگاہِ عظیم سے ہی مل سکتا تھا)۔ یہ وہی صورت تھی جو صاحب ضرب کلیم، بنی اسرائیل کے شاہی بچوں کی تربیت کے ذریعے بروئے کار لائے تھے۔ اسے پیش کرتے ہوئے فکرِ قرآنی کے نقیب نے پکارا۔

یہ نشاۃِ ثانیہ نہ تو ان اسمبلیوں سے پیدا ہو سکے گی، نہ وزارتوں کے کابینوں سے، نہ یہ ملا کے حجروں سے ابھرے گی، نہ شیخِ طریقت کی خانقاہوں سے۔ اس کی ابتدا (جیسا کہ ہم شروع سے کہتے چلے آرہے ہیں) درسگاہوں سے ہوگی۔ قرآنِ کریم نے اس کی یہی شکل بتائی ہے جب اس نے کہا کہ نظامِ ربوبیت کے قیام کی صورت میں بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون۔ ضابطۂ خداوندی کو سمجھنا سمجھانا اور اسے اس قدر دہرانا کہ یہ دلوں میں اتر جائے۔ ہم نے اس سے پہلے بھی کہا تھا اور آج اسے پھر دہراتے ہیں کہ جو لوگ اس طریقِ کار کی اہمیت کو پہچانتے ہوں۔ وہ سر سید بن کر اٹھیں اور ملک میں دو چار ایسی درسگاہیں قائم کر دیں جن میں قرآن کریم کی تعلیم دی جائے ـــــ ملا کے قرآن کی نہیں، خدا کے قرآن کریم کی ـــــ جو انسان کو صرف تسخیرِ ارض و سما کے راز ہی نہیں بتاتا بلکہ اس پر اقطار السموٰت والارض سے آگے نکل جانے کی راہیں بھی کشادہ کر دیتا ہے۔ ان تجربہ انسانوں کو چھوڑو کہ جنھوں نے جو کچھ بننا تھا بن چکے۔ اپنی تمام توجہات مرکوز کر دو ان سیالِ قلوب (یعنی آنے والی نسلوں) پر جنہیں تم جس قالب میں ڈھالنا چاہو، ڈھال سکتے ہو۔ اس سرزمین کی حفاظت کا انتظام رکھو اور اس متاعِ عظیم کے امین تیار کرنے کے لئے درسگاہیں تیار کرو۔ دس پندرہ برس تک، نہایت خاموشی سے ان درسگاہوں کو مصروفِ تعلیم و تربیت رکھو۔ اس کے بعد دیکھو کہ ان سے کس کس قسم کے شاہباز نکلتے ہیں۔ اسی قسم کے شہباز کہ

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا

سیاست والوں کے ہنگامے ان کے حوالے کر دو۔ بزنس والوں کو چور بازاری کی بھول بھلیوں میں الجھا رہنے دو۔ یہ سب میدان ان کے لئے چھوڑ دو اور تم قوم کے بچوں کو سنبھال لو۔ تم دیکھو گے کہ آخر الامر ان سب کی متاع کاسد ثابت ہوگی۔ ان کے کاروبار میں نقصان کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ ان کی کھیتیاں جھلس کر رہ جائیں گی۔ لیکن جس تخمِ صالح کی آبیاری تم کرو گے وہ ایک دن ایسا تناور درخت بن جائے گا جس کی شاخیں فضائے عالم میں مسرتوں کے جھولے جھول رہی ہوں گی۔

کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء (ایضاً۔ ص ۱۴)

ـــــ ✻ ـــــ